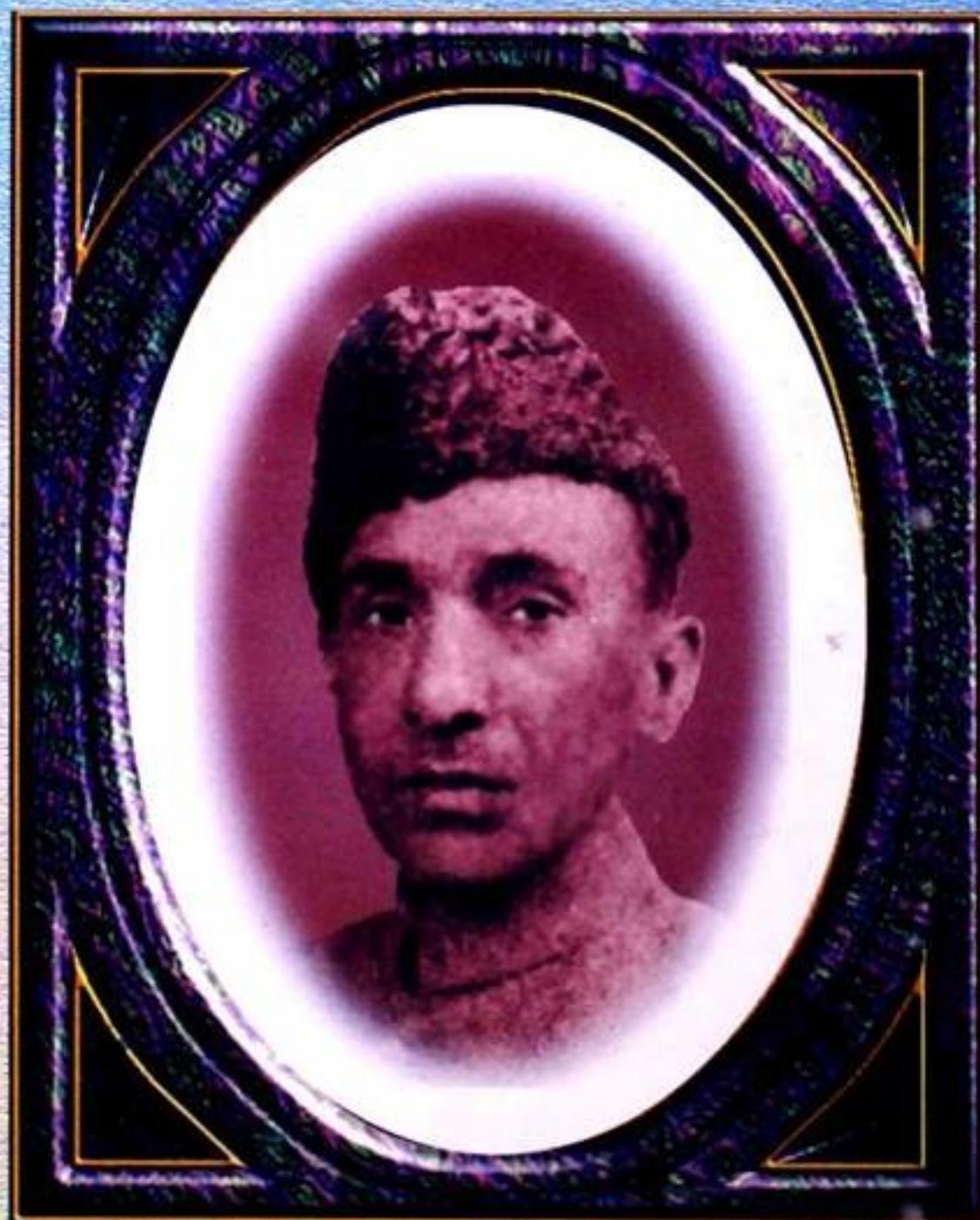
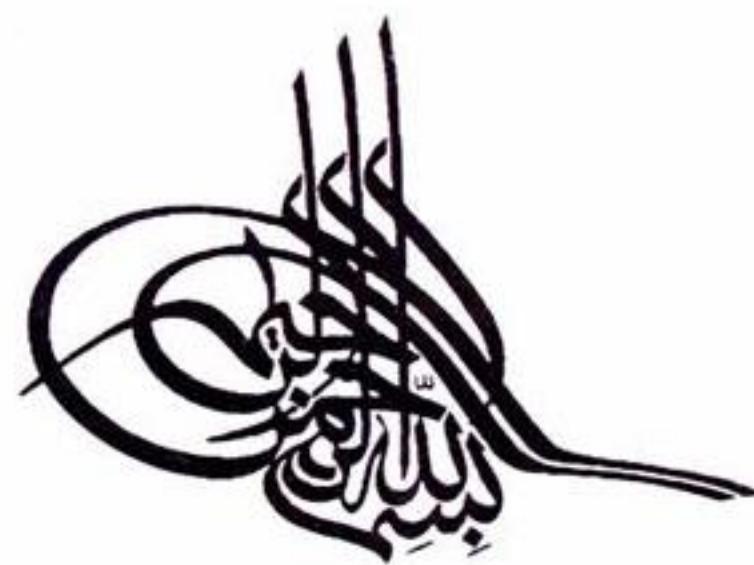


حافظہ جالشہری

کا فن



ڈاکٹر رینہ حسن



(عہد احترام)

محروف ادب و ناقد
ڈاکٹر کمال اللہ صدیقی مالک
کی خدمت سے
شروعی تراجمہ

حفیظ جالندھری کافن

ڈاکٹر زرینہ رحمن

سماں
تہذیب
سماں طبع ۲۰۷

حفیظ جالندھری کافن

ڈاکٹر زرینہ رحمن

© ڈاکٹر زرینہ الرحمن

HAFEEZ JALANDHARI KA FUN

Dr. Zarina Rahman

Edition : 2007, Price : Rs : 200

ISBN : 81-8314-059-9

تصنیف	: حفیظ جالندھری کافن
مصنفہ	: ڈاکٹر زرینہ الرحمن
ناشر	: ڈاکٹر عبید الرحمن
اشاعت اول	: 2007
قیمت	: 200 روپے
کمپوزنگ	: محمد اکرم خاں
سرورق	: جاوید اشرف
مطبع	: اچ-ایس آفیٹ پریس، چاندنی محل، نئی دہلی 110 002

ملنے کے پتے

ا حصتنا

● بہس پر بنیاد پرستہ 2241، کوچہ چیلان، دریائی نخ، نئی دہلی - 110002

● مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر، نئی دہلی؛ ممبئی، علی گڑھ

● بک ایمپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنه 800 004

● ڈاکٹر عبید الرحمن، M-2، ریگل بلڈنگ، اسٹریٹ 6، ذا کرنگر، نئی دہلی 110 025

● حیات بہما کیشنز، A-595، امرپوری، نبی کریم، نئی دہلی 110 055

افتہاب

اپنے والدین

کے نام

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں



فہرست

○	پیشگفتار	9
○	حرف آغاز	12
باب اول	حفیظ جالندھری اور ان کا عہد	16
باب دوم	نظم نگاری	35
باب سوم	مشنوی نگاری	60
باب چہارم	غزل گوئی	83
باب پنجم	گیت	100
باب ششم	شاعرانہ عظمت	111
○	حرف آخر	131
○	کتب و رسائل	141

پیش گفتار

بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہونے والے اردو شاعروں میں حفیظ جالندھری ایک اہم نام ہے۔ غزل، نظم، مثنوی، گیت، سلام وغیرہ تمام اصناف شاعری میں جو قبول عام اور شہرت دوام حفیظ کو نصیب ہوئی وہ کم ہی کسی کو ملی ہے۔ حفیظ کا اولین مجموعہ 'نغمہ زار' نے شعروخن کے باذوق قارئین کی توجہ جس طرح اپنی جانب چینی اس کی نظر اردو شاعری میں اس سے قبل نہیں ملتی۔ ایک طرح سے یہ اردو شاعری میں بالکل نیا اور تازہ تخلیقی تجربہ تھا جس میں بڑی فناواری کے ساتھ نظموں اور گیتوں کو ایک ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ اس مجموعہ کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد دین تاثیر جیسی نابغہ روزگار شخصیت نے کہا تھا "میرے دل میں جو جگہ نغمہ زار کی نظموں کے لیے ہے وہ کسی اور کے لیے نہیں۔ نغمہ زار کے بعد حفیظ نے جو کچھ لکھا ہے وہ فن اور نفس مضمون کے اعتبار سے بلند تر ہے مگر جو سبک سیری اور جو فرحت فراہمی نغمہ زار کے الفاظ و معنی اور بحور میں ہے وہ اور کہیں نہیں۔" ڈاکٹر تاثیر کی رائے کس قدر درست ہے ہم اس کا اندازہ اس مجموعہ کی صرف ایک نظم ابھی تو میں جوان ہوں سے ہی اچھی طرح لگا سکتے ہیں۔ اس نظم کے اشعار نے پوری دنیا میں دھوم مچادی تھی اور حفیظ کی وفات تک شاگردنی شاعری ان سے اس نظم کو سنانے کی فرمائش کرتے رہے۔ مجھے آج بھی پنہ کی ۱۹۷۷ کی وہ شام یاد ہے جب ۷۷ برس کی عمر میں حفیظ جالندھری نے لہک لہک کر ابھی تو میں جوان ہوں، پڑھنا شروع کیا اور سامعین گویا وجہ کی کیفیت میں جھومتے رہے۔

حفیظ کا ایک بڑا کارنامہ 'شاہنامہ اسلام' کی شکل میں دنیا کے شعروادب میں محفوظ ہے۔ یہ اگرچہ اسلامی تاریخ ہے اور واقعات جانے پہچانے ہیں مگر شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس کے تقریباً تمام نکڑے قاری کے ذہن و دل پر اپنا عکس چھوڑ جاتے ہیں۔ دس ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی اردو میں اپنی مثال آپ ہے۔ کوئی بعد نہیں کہ روزِ قیامت یہ شاہنامہ ان کی شفاعت کا وسیلہ بن جائے۔

حفیظ نے ہم عصر غزل میں بھی اپنی جگہ بنائی۔ ان کی غزلوں کے نامعلوم کتنے اشعار زبانِ زدِ خاص و عام ہیں۔ یہاں بھی وہی بے ساختگی، روانی اور نغمگی ملتی ہے جو شاعر کا طرہ امتیاز ہے۔ مگر یہ صحیح ہے کہ حفیظ کا اصل میدانِ نظم اور گیت ہے۔ ان کی ایک مشہور نظم کا ذکر اوپر کیا گیا، اسی طرح جلوہ سحر، فرحت کی تلاش، کرشن کنہیا، طوفانی کشتی، کربلا، انہی جوانی، موت کا قافلہ ہلال عید وغیرہ حفیظ کی دیگر ایسی نظمیں ہیں جو اپنی شیرینیت، نغمگی اور جادو بیانی سے ہمارے دامنِ دل کو کھینچتی ہیں۔ گیتوں کے حوالے سے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حفیظ نے گیتوں کو ایک نئی زندگی عطا کی اور صرف اردو یا ہندی الفاظ کو ہی نہیں بردا بلکہ فارسی آمیز گیت بھی لکھے۔ جہاں ایک طرف فارسی آمیز گیت ہیں وہیں دوسری طرف بچوں کے لیے سہل اور دلچسپ انداز کے گیت بھی ملتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنفہ نے حفیظ کے گیتوں کے حوالے سے بہت اچھا جملہ ادا کیا ہے کہ "حقیقت یہ ہے کہ اردو گیت حفیظ کے ہاتھوں یک ایک بالغ ہو جاتا ہے" حفیظ کے مشہور گیتوں میں جاگ سو ز عشق جاگ، دل ہے پرانے بس میں، جھونا سب سنسار، میر اسلام لے جا، کرشن بنسری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حفیظ نے اتنے حوالوں سے شاعری کی ہے کہ پروفیسر مرزا احمد منور نے انہیں کئی روپ کا شاعر قرار دیا ہے اور انہیں شاعر اسلام حفیظ، شاعر نعت حفیظ، شاعر کشمیر حفیظ، شاعر فطرت حفیظ، شاعر شباب حفیظ، شاعر غزل حفیظ، گیتوں کا حفیظ، بچوں کا حفیظ کہا۔

حفیظ جالندھری کے ادبی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے مگر اس کے باوجود

یہ بھی حقیقت ہے کہ حفیظ کو کافی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے یعنی ان پر اس انداز اور اس رفتار سے کام نہیں ہوا ہے جیسا ان کا حق ہے۔ یہاں یہ بات واقعی قابلِ اطمینان ہے کہ اس کتاب کی مصنفہ ڈاکٹر زرینہ رحمن نے یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک اچھا تحقیقی کام انجام دیا ہے۔

کتاب کے مسودے کو پڑھنے سے یہ احساس ہوا کہ زرینہ رحمن نے حتی المقدور حفیظ جالندھری کے فن سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے مطالعہ اور صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کے محاسن و معایب پر نظر ڈالی ہے۔ حفیظ جالندھری پر اب تک ہندوستان میں بہت کم کام ہوا ہے لہذا ایسی صورت میں مصنفہ نے یہ کتاب لکھ کر گویا ایک خوبصوردار ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ ظاہر ہے مصنفہ کے نقطہ نظر سے قارئین اختلاف بھی کر سکتے ہیں اور تنقید کی گنجائش بھی نکل سکتی ہے مگر ان سب کے باوجود یہ ضرور ہے کہ یہ کتاب حفیظ شناسی میں بہت حد تک معاون ہو گی اور وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرے گی۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی

حرفِ آغاز

حفیظ جالندھری کے فن پر گفتگو آسان نہیں ہے۔ میں نے کسی حد تک یہ کوشش کی ہے کہ ان کی فنکاری کو اجاگر کر سکوں۔ حفیظ نے نظم نگاری، غزل گوئی، مثنوی نگاری اور گیت کے میدانوں میں بعض اہم اضافے کیے ہیں۔ نظم نگاری میں انہوں نے جو ہمیتی تجربے کیے ہیں وہ ما بعد کے شعرا کے لیے نشان راہ ثابت ہوئے۔ گیت کے میدان میں اور بچوں کے لیے جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں وہ بھی ہمارے دیدہ و دل کو متوجہ کرتی ہیں۔
یہ کتاب چھ ابواب کو محیط ہے:

پہلا باب حفیظ جالندھری اور ان کے عہد سے متعلق ہے۔ اس میں حفیظ کی مختصر سوانح عمری ہے اور ان تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی تحریکات کو احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جنہوں نے شاعر کی فکر اور اس کے فن کو متاثر کیا ہے۔ اگر چہ یہ باب دوسرے باب سے غیر متعلق سالگتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ شاعر اور فنکار اپنے ماحول اور عہد سے متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے کسی کے کلام اور فن کی تنقید کے لیے ضروری ہے کہ اس کے عہد سے کلی واقفیت حاصل کی جائے۔ اس طور پر یہ باب دوسرے ابواب سے غیر متعلق نہیں ہے بلکہ اپنے ما بعد کے ابواب کے لیے پس منظر کا کام سرانجام دیتا ہے۔ اس باب میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ شاعری حفیظ کے لیے کبی نہیں ہے۔ کیونکہ جالندھر کی سر زمین خاندانی روایات اور ماحول ایک بڑے شاعر کو پیدا کرنے کے لیے سازگار نہ تھے۔ لیکن جب انہوں نے شاعری

کے کوچے میں قدم رکھا تو اپنے ماحول سے کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے شاعری کی بنیاد صالح روایت پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا خاندان مذہبی واقع ہوا تھا۔ چنانچہ ان کا پہلا شعر اور مرنے کے وقت ان کی زبان سے نکلے ہوئے اشعار ایک ہی محور پر گردش کرتے ہیں۔

دوسرा باب حفیظ جالندھری کی نظم نگاری سے متعلق ہے۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ ان کی شاعری مقصدی ہے۔ وہ شاعری اور فنکاری کے لیے کسی گروہ یا جماعت سے مسلک ہونا ضروری نہیں خیال کرتے۔ ان کی شاعری کا محرک ان کا مذہبی جذبہ ہے۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے کبھی کبھی معاشرے کے ان لوگوں کو بھی اپنا موضوع تختن بنایا ہے جو عام طور سے ترقی پسند شعرا کے پسندیدہ موضوعات رہے ہیں۔ ان کی نظمیں بیانیہ نوعیت کی ہیں۔ ان میں موسیقیت اور ترجم کے آبشار ہیں۔ تاہم ان کی نظمیں جوش، اقبال، سیماں اور جمیل مظہری کی نظموں سے میل نہیں کھاتیں۔ انہوں نے نظم نگاری کے میدان میں جو ہمیستی تجربے کیے ہیں وہ قابل احترام ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی نظمیں بھی ہماری توجہ کی مستحق ہیں۔

تیرے باب میں حفیظ جالندھری کی مثنوی نگاری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے مطالعہ سے یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ حفیظ کی شہرہ آفاق تصنیف شاہنامہ اسلام بحیثیت مثنوی ناکام ہے۔ عام طور سے شاہنامہ اسلام کا موازنہ شاہنامہ فردوسی سے کیا جاتا ہے مگر فنی حیثیت سے اس میں اتنی بھی پختگی نہیں ہے جتنی حآلی کی مثنوی مذہبی موجز اسلام میں ہے۔ چوتھے باب میں حفیظ جالندھری کی غزل گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں روانی، شکفتگی، اثر آفرینی، شیرینی اور موسیقی کا ایک امنڈتا ہوا سیلا ب ہے۔ نازک خیالات اور گھرے افکار ان میں پیش ہوئے ہیں لیکن ان کی زبان بہت ہی سادہ، سلیمانی اور شگفتہ ہے۔ ان کی یہ خوبیاں عوام کے دلوں کو برماتی

ہیں۔ اس لیے اگر چہ وہ ناقدوں کو متأثر نہ کر سکے مگر عوام کے دلوں میں جگہ پانے میں کامیاب ہوئے۔

پانچواں باب حفیظ کے گیتوں سے متعلق ہے۔ اس باب میں یہ روشن کیا گیا ہے کہ گیت حفیظ کے ہاتھوں اپنی بلند یوں تک پہنچا۔ ان میں ہندوستان کا دل دھڑکتا ہے۔ حفیظ کے گیت مختلف موضوعات کو اپنے احاطہ تحریر میں لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی خوبیوں کے پیش نظر اردو کے ناقدوں نے حفیظ کو اول درجہ کا گیت نگار کہا ہے۔

چھٹا باب حفیظ کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کرتا ہے۔ اس باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حفیظ نے حالی اور اقبال کے بعد اردو شاعری میں بعض مفید اضافے کیے ہیں۔ اس سلسلے میں ساغر نظامی کے اس بیان کو منی بر صداقت بتایا ہے:

”حفیظ جالندھری ہندوپاک کے ان چند شاعروں میں سے ایک
تھے جن کا تاریخ ادب میں نام رہے گا۔ حفیظ نے روایت کے حلقوں میں
رہ کر اردو غزل کو فرود غ دیا۔ اپنی نظموں سے اردو کو نئے اسالیب دیے۔
شاہنامہ لکھ کر مسلمانوں کی خدمت کی۔ تمام عمر اردو کی خدمت میں گزاری۔
کئی رسالوں کی ادارت کی۔ ادبی اداروں میں کام کیا۔“

اس جائزہ کے تحت یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بعض اصناف کو برتنے میں حفیظ نے ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض اصناف کو ان سے جلا ہوئی ہے۔ بہر حال، ان مطالعوں کی روشنی میں حفیظ کافن جس طرح ابھرتا ہے اسے بے کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اس مشکل کام کو کتنی کامیابی سے سرانجام دے سکی ہوں یہ بارگراں آپ پر چھوڑتی ہوں۔

اس کام کو انجام دینے میں پروفیسر محمد سلیمان (مرحوم) نے میری حد درجہ مدد کی اور محبت و شفقت کا مظاہرہ فرمایا تھا، دعا کرتی ہوں کہ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ پروفیسر عبدالواسع اور ڈاکٹر عطاء الرحمن (صدر، شعبۃ اردو، ایل ایس کالج، مظفر پور) کے لیے

احسان مندی اور ممنویت کا اظہار کرتی ہوں۔

پروفیسر شمیم حنفی اور اپنے محترم بھائی پروفیسر انیس الرحمن کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں میری رہنمائی فرمائی۔ اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبید الرحمن کا شکر یہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

اپنے والدین اور رفیق حیات ڈاکٹر محمد سمیع اللہ کے علاوہ اپنے بھائی مطیع الرحمن، اور اپنے بچوں کی محبت اور خلوص کی معرفت ہوں۔
اللہ کے حضور شکر کے جذبے کے ساتھ۔

زرینہ رحمٰن

۲۰۰۷ء/جنوری ۱۵

حفیظ جالندھری اور ان کا عہد

شعر و ادب کی دنیا میں حفیظ کے حمایتی کم ہیں اور مخالف زیادہ، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنا شعری سفر اس وقت شروع کیا جب ملک سماجی، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور ادبی لحاظ سے عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ نئی اور پرانی قدر میں دست و گریاں تھیں، حفیظ نے ۱۹۲۳ء میں ایک نظم فرست کی تلاش کی۔ یہ نظم قدیم طرز اظہار اور قدیم اصول افکار سے ہٹی ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد لکھنؤ میں بہت دنوں تک حفیظ کی مخالفت ہوتی رہی۔ لوگوں نے بے تک شاعر اور بے تک نظم کے عنوان سے اس نظم اور حفیظ پر بہت دنوں تک طعن و تشنیع کے تیر بر سائے۔ حقیقت یہ ہے کہ روایت سے بغاوت کی یہ آواز ذرا قبل از وقت تھی۔ اس وقت تک ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا اور لوگ اپنے شعری اصول و افکار میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے۔ لیکن جب ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز ہوا اور روایت سے بغاوت کرنے والوں کی پذیرائی کا وقت آیا تو حفیظ ایک خاص طرز کے شاعر کی حیثیت سے مانے اور پہچانے گئے۔ اس لئے فرست کی تلاش، اور ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر کچلوکی فرماش پر پہلی قومی نظم کا نگریں کے جلسے میں پڑھنے کے جرم میں قید و بند کی صعوبت، کشمیر میں کہی گئی نظم، چشمہ درناگ پر ایک آنسو، جس سے روشنی لے کر شیخ عبداللہ نے کشمیر میں آزادی کی جدوجہد شروع کی اور ریاست خیر پور میں رقصہ، نظم پڑھنے کے جرم میں گرفتاری کے باوجود وہ اپنی جگہ ترقی پسندوں میں نہیں بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر شعراء، ادباء اور

ناقدین کی طرف سے ان کے دل میں ہزاروں شکایتیں ہیں۔ اپنے مجموعے کلام و تخلصہ شیریں، کے دیباچہ میں حفیظ معاصر شعراء، ادباء اور ناقدین کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”۱۹۲۱ میں جب میں نے پہلے پہل روایتی اندازخن سے الگ
ہٹ کر اپنے انداز سے لکھنا شروع کیا تھا اسی وقت سے میرا ان سے سابقہ
ہے۔ اس وقت میں تازہ وارد تھا۔ دنیا یے شعروخن کو باغ بہشت سمجھ کر
آزادرباشد کے یقین پر داخل ہوا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہاں جنگل کا قانون
ہے۔ مجھے ایسی مخلوق کی بھیز بھاؤ میں سے بھی راہ نکالنی پڑی ہے جس کا
شوراب بھی دبوچ لینے، نکابونی کرڈا لئے اور کھاجانے سے آگے نہیں بڑھا۔
باغ ادب ان کی شکارگاہ ہے۔ مجھے ان کے دکے سے بھی دوچار ہوتا
پڑا۔ ٹولیاں بھی مجھ پر لپکیں جھپٹیں... اے راہی ادب، اے مسافر شعروخن،
اگر تیرے پاس بے پردا مسکراہٹ کا زبردست عصا نہیں تو اس باغ میں
داخل نہ ہونا اس جنگل سے نہ گزرنا۔

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل

تیرا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جائے

یہی وجہ ہے کہ افکار نے جوش نمبر کے فوراً بعد حفیظ نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا اور
اس کی تیاریوں میں حفیظ سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا:

”دیکھئے جوش نمبر کے لئے لکھنے والے جو بزرگ ہیں اس طرز

کے لوگ حفیظ نمبر کے لئے لکھنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً بقول آپ کے
میری سب سے یاد اللہ ہے۔ ان میں سے اکثر اہل نظر بھی ہیں۔ اسلوب
بیان کی نزاکتوں کو اور زبان کی انوٹوں کو جاننے والے بھی ہیں۔ میری

تعسین بھی فرماتے ہیں لیکن پرانا جذبہ تربیت و طینت وافر ہو وہاں کندہم
جس باہم بہم جنس پرواز کا نقش ہر عالم پیدا و ہو یاد رہتا ہے۔“ ۱

حفیظ جالندھری کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کا ایک سرسری مطالعہ اس حقیقت
کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کی شاعری مقصدیت سے پرے نہیں۔ مقصدیت کی لہریں ہر آن انھی
ہیں مگر یہ لہریں ان لہروں سے الگ اور مختلف ہیں جو ترقی پسندابی تحریک کے زیر اثر انھی
ہیں۔ حفیظ کی مقصدیت کی لہروں پر حالی اور اقبال کی چھاپ ملتی ہے۔ اس لئے اس میں تعمیر
کا غصر ہے۔ ان کی شاعری کی تنقید و تشریح جہاں کی جائیگی وہاں اس پر باتفصیل روشنی ڈالی
جائے گی۔ ان کی شاعری اتنی کم وقت نہیں ہے کہ اہل نظر کے قلم کو جنبش نہ ہو مگر گروہ بندی
نے ان حضرات کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ حفیظ کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ
اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے گیت کے میدان میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا
ہے۔ شعرو شاعری کی یہ خدمت حفیظ نے جس سرز میں میں اور جس عہد میں کی وہ سیاسی
سماجی، معاشی، اقتصادی اور شعرو شاعری نیز فنکاری کے لحاظ سے بہت ہی اتھل پتھل کا
ہے۔ اس لئے کی حفیظ کی فنکاری سے کما حقہ واقفیت کے لئے ضروری ہے کہ اس عہد کے
نشانات کی شناخت بھی کرتے چلیں۔

فنکار کے عہد کا مطالعہ اس کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں بہت مدد و معاون ہوتا
ہے۔ کسی کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں اس کے موروثی اوصاف اور ماحول کا ہاتھ
ہوتا ہے بلکہ موروثی اوصاف میں بھی ماحول کی کرنیں موجود رہتی ہیں۔ رسم و رواج، روایت
و عقائد سب ماحول کے پروردہ ہیں کہ نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ہر گوبند کھرانہ کی جدید تحقیق نے
یہ اکشاف کیا ہے کہ موروثی اوصاف میں تبدیلی کرنا عین ممکن ہے۔ اس سے یہ بات روشن
ہوتی ہے کہ شخصیت کے بنانے اور بگاڑنے میں ماحول کا کتنا اہم روپ ہوتا ہے۔ شخصیت کی

تعمیر و تشكیل میں ماحول کی اس اہمیت کے پیش نظر روی سامنے دانوں کا خیال ہے کہ موروثی اوصاف کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ جس فرد کو جیسا بنانا ہے اس کے لئے ویسا ماحول پیدا کیجئے اور وہ ویسا بن جائے گا۔ بہر حال، اس بات سے قطع نظر کہ کسی کی شخصیت کی تعمیر و تشكیل میں موروثی اوصاف کا کتنا داخل ہوتا ہے اور کتنا ماحول کا، میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ کسی فنکار کے عہد کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کہ اس سے اس کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور شخصیت کی مدد سے اس کے فن کے چہرے سے نقاہیں اٹھتی ہیں۔ چنانچہ حفیظ جالندھری کے عہد کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنے کی ضرورت ہے۔

حفیظ جالندھری کی شخصیت جس ماحول میں پروان چڑھی اسے انقلاب آفریں کہنا چاہئے۔ ان کی پیدائش کے چالیس بیالیس سال قبل جو انقلاب آیا اس نے انگریزوں کے قدم سرز میں ہندوستان میں مضبوطی سے جمادئے اور پیدائش کے سینتالیس سال بعد کے انقلاب نے ان کے جمے ہوئے قدم کو اکھاڑ پھینکا۔ اس طرح حفیظ جالندھری نے جس ماحول میں پروش پائی وہ بالکل عبوری دور ہے۔ اس میں مایوسی اور محرومی بھی ہے اور جوش و خروش بھی، انقلاب کی دھمک بھی اور استقلال کی صحیح امید بھی۔ انہوں نے ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک سورج کو غروب ہوتے اور دوسرے کو طلوع ہوتے دیکھا۔ اس طرح ان کا عہد واضح طور پر دو دوسرے پر مشتمل ہے۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد۔

آزادی سے قبل کا عہد ہندوستان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور ادبی لحاظ سے اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کی مکمل حکمرانی ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی غیر ملکی عفریت کے کتے ہوئے شکنخوں سے آزادی پانے کی آخری کوشش تھی۔ ہماری اپنی ہی کمزوریوں نے اس شکنخ کو پاش پاٹھونے نہیں دیا اور نوے برس تک ہندوستان کا استحصال ہوتا رہا۔ انگریز فتح کے نئے میں ایسے چور ہوئے کہ ظلم و ستم، جور و جبر کا بازار کھلے عام گرم کیا۔ ہندو اور مسلمان کے درمیان تفرقہ ڈالا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد

رکھی۔ ظلم و ستم کا جو بازار گرم ہوا اس کے بہت دھنڈھلے نقوش غالب کی تحریروں سے ملتے ہیں۔ بریت کے کتنے ہی نشانات ضبط تحریر نہ ہوئے۔ ۱۸۵۷ کے بعد انگریزوں نے جبر و تشدد کا بازار جس طور پر گرم کیا وہ ایک خونپکاں داستان ہے۔ اس کا ایک بہت ہلاکا سانقش غالب کے مندرجہ ذیل بیان میں ملتا ہے جو انہوں نے نواب سید محمد علی خاں بہادر فردوس مکاں کی خدمت میں ۱۲ جنوری ۱۸۵۸ کو مرقوم کیا ہے:

”ہرگاہ شہر بر دست سپاہ انگریز فتح شد ہمہ جا گیردارانہ و پنسہ اران
از شہر بد رفتند، چنانکہ تا امروز آوارہ دشت و کوه اندمن از جانہ چنیدم و ہم
چنان گوشہ گیرماندم۔ دریں بندوبست کہ خاصہ از بہر سیاست مجرمان است و
تحقیقات جرم از روی دفتر قلعہ و اطہار مجرمان می کند، پنج گونہ آلاش دامن من
پدید نیامد و دار و گیر و باز پرس رو نداد۔“^۱

مرزا تقیہ کو اردو میں اس طرح رقم کیا ہے:

”... مبالغہ نہ جاننا، امیر و غریب سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ
نکالے گئے۔ جا گیردار، پیش دار، دولت مند اہل حرفہ کوئی نہیں ہے۔ مفصل
حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، ملازمان قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور
دار و گیر میں بتلا ہیں مگر وہ نوکر جو اس ہنگامہ میں نوکر ہو گئے ہیں اور ہنگامے
میں شریک رہے ہیں ... دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہوتا اور کہیں
جانا تو بہت بڑی بات ہے رہایہ کہ کوئی پاس آوے، شہر میں ہے کون، گھر
کے گھر بے چراغ پڑے، مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست
یا زدہم مسی سے آج تک شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و
بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم۔“^۲

۱ مکاتیب غالب، مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی، صفحہ ۹

۲ مکاتیب غالب، مرتبہ: امتیاز علی خاں عرشی، صفحہ ۱۲۵

حفیظ جالندھری اور ان کا عہد

انگریزوں نے نہ صرف یہ کہ جور و ستم کا بازار گرم کیا بلکہ ہندوستان کا خوب خوب استھصال بھی کیا۔ ابتدا میں مسلمانوں کو نشانہ ظلم بنایا کہ ان کے خیال میں ان کی حکومت کو خطرہ نہیں سے تھا کیونکہ حکومت انہوں نے ان سے لی تھی۔ سر سید کی علی گڑھ تحریک اسی باعث وجود میں آئی۔ لیکن بعد میں بعض ایسے اقدامات بھی کئے جن کو ہندوؤں نے پسند یادگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور مسلمانوں کے حق میں مفید گردانا اس طور پر ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت اور تفرقہ کی ایسی خلیج قائم کی جو آج بھی باقی ہے۔

ہندوستان کی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ماحول کو بھی انہوں نے بڑی تیزی سے پراؤ گندہ کیا۔ جدید سائنسی امکنויות فروغ پائے۔ مصنوعات تیار ہوئیں اور بڑی تعداد میں ہندوستانی بازار میں فروخت ہونے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کو شدید نقصانات اٹھانے پڑے۔ ہندوستانیوں کے معیار زندگی میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ انگریزوں نے اپنے سے قریب انہیں ہندوستانیوں کو کیا جو انگریزی کی شدید رکھتے تھے اور انگریزی آداب معاشرت کے دلدادہ تھے۔ دیسی صنعت و حرفت اور دستکاریوں کی شہرگ کٹ گئی اور ان سے وابستہ حضرات تلاش معاش میں کھیتوں اور کھلیانوں کی طرف واپس لوٹنے پر مجبور ہوئے۔ امیر و غریب کے علاوہ بنئے، مہاجنوں اور زمینداروں کا ایک تیسرا طبقہ معرض وجود میں آیا۔ یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ یہ طبقہ برابر انگریزوں کا وفادار رہا۔ ان حالات نے ہندوستان کی معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ماحول کو پراؤ گندگی اور انتشار میں بنتا کر دیا۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے الگ الگ بعض ایسی تحریکوں کو فروغ دیا جن کا مقصد قدیم مذہب اور خیالات کو نئے حالات سے ہم آہنگ کرنا تھا اور انگریزی تہذیب و معاشرت کے بڑھتے ہوئے سیلاں کو روکنے کے لیے بندھ باندھنا تھا۔ ان تحریکوں کے متعلق خلیل الرحمن عظمی نے رقم کیا ہے:

”یوں تو ہندوستان میں سیاسی و قومی بیداری کا آغاز بہت پہلے

ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک، وہابی تحریک، فرانسیسی تحریک، راجہ رام موہن رائے اور کیش ب چندر سین کی تحریکیں، سرسید کی علی گڑھ تحریک اور بعض دوسری اصلاحی تحریکوں کا مطالعہ تاریخ و عمرانیات کے طالب علموں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان تحریکوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ کس تیزی سے ہندوستانی ذہن بیرونی تسلط سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔^۱

اس سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز حسین کا خیال ہے کہ ان میں سے بعض تحریکوں نے دو ایک ایسے اصول وضع کئے جس نے اہل زہب کو غور و فکر پہ مجبور کیا اور پرانے مذہب کو نئے حالات سے ہم آہنگ کیا۔ ملاحظہ ہوا:

”برہمہ سماج اور آریہ سماج نے اپنی طرف سے کچھ ایسے اصول بنائے جو اہل مذہب کو سوچنے سمجھنے کا مزید موقع دیں۔ نئے خیالات و طریقہ کار سے پرانے مذہب کو نئے دور سے ہم آہنگ کر لیں۔ برخلاف اس کے رام کرشن مشن نے انہیں پرانی باتوں کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ اپنی طرف سے کسی نے نظریے کا اضافہ نہیں کیا۔“^۲

ان تحریکوں کا جائزہ اگر بغور لیں تو یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ صرف رام کرشن مشن ہی ایسی تحریک ہے جس میں قدیم خیالات کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہیں ملتی ورنہ باقی تمام تحریکیں قدیم خیالات کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی غرض و غایت سے وجود میں آئیں۔ ان تحریکوں کے روح روایاں اگرچہ دل ہی دل میں انگریزوں سے نفرت کرتے تھے مگر کھل کر ان کی مخالفت کرنے کے لیے فضاسازگار نہ پاتے تھے اس

^۱ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمن عظمی صفحہ ۱۹

^۲ اردو شاعری کا سماجی پس منظر از ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۳۱

لئے ان طریقوں سے قومی احساس اور ملی شعور کو بیدار رکھنا چاہتے تھے۔

مسلمانوں میں بھی ایسی تحریکیں چلیں۔ ان میں ایک تحریک وہابی تحریک کے نام سے بد نام ہوئی۔ اگرچہ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو اسلامی عقائد و خیالات پر مضبوطی سے قائم رکھنا تھا مگر انگریزوں نے اس کو اپنے لئے مضرت رسائیں بھی کر بد نام بھی کیا اور سکھنے کے لئے کوئی دلیل اٹھا نہیں رکھا۔ دوسری تحریک سر سید کی علی گڑھ تحریک ہے۔ اس تحریک کا مقصد مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے بہرہ دو کرنا، انگریزی معاشرت سے قریب کرنا اور انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے جوشکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے ان کو رفع کرنا تھا۔ گویا ایک طرف سر سید مسلمانوں کو انگریزی اور انگریزوں کی معاشرت سے قریب لا کر ان کی مرعوبیت اور احساس کمتری کو دور کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں پر ہونے والے جور و ستم کو کم کرنا چاہتے تھے۔ ان ضمن میں رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے:

”سنہ ۱۸۵۷ کے انقلاب نے ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے خاتمے اور انگریزی حکومت کے بر سر کار آنے کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کے لئے یہ حادثہ ”زمین سے آسمان تک سوتھنی کا باب تھا۔“ سر سید اور مسلمان انگریزوں کے قہر و غصب کی زد میں تھے۔ خود سر سید مسلمانوں کے زیر عتاب تھے۔ انگریزوں کو ہندوؤں سے نہ کوئی تاریخی پر خاش تھی نہ مذہبی نہ سیاسی، مسلمانوں سے دونوں کو تھی۔“^۱

بہرحال ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے اصول معاشرت، دینی اور مذہبی خیالات، رسوم و عقائد، طرز معاشرت وغیرہ میں لپک پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ احساس قومی و ملی بھی بیدار رہے اور انگریزوں کی قربت کا فائدہ بھی ملے۔

¹ سر سید اور علی گڑھ از پروفیسر رشید احمد صدیقی بحوالہ علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتبہ: نسیم قریشی

چنانچہ فری مشن انجمن، برہمو سماج، آریہ سماج، رام کرشن مشن، تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ اس مقصد کے تحت معرض وجود میں آئیں۔ ان انجمنوں، سوسائٹیوں اور جلسوں کے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین نے مندرجہ بالاسطور میں لکھا ہے کہ رام کرشن مشن کو چھوڑ کے باقی جتنی تحریکیں انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد ہندوستان میں وجود پذیر ہوئیں ان کا مقصد خاص جدید تقاضوں سے قدیم خیالات کو ہم آہنگ کرنا تھا۔ یہ امر بھی دلچسپ ہے کہ ان کے بانی دل سے انگریزوں کے ہم نوا اور حمایتی نہیں تھے بلکہ حالات کی کروٹ نے انہیں مجبور کر رکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں انگریزوں سے نفرت کرتے تھے مگر کھل کر ان کی مخالفت کرنے کی ہمت اور سکت اپنے میں نہیں پار ہے تھے۔ اس لئے انگریزوں سے بظاہر قربت کا دعویٰ کرتے تھے مگر یہ باطن میں قومی و ملی، دینی و تہذیبی احساس کو بیدار رکھنا چاہتے تھے۔ ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں میں ایسی تحریکیں زیادہ قوت اور زور شور سے پروان چڑھ رہی تھیں جبکہ مسلمانوں میں وہابی اور علی گڑھ تحریک ہی اس کام کو سرانجام دے رہی تھیں۔ اکبر کی ظریفانہ شاعری اور شبلی کی تاریخ نویسی میں بھی یہی جذبے موجود تھے۔ البتہ یہ حضرات سرسید کے اس خیال کو بھی ناپسند فرماتے تھے کہ انگریزوں سے قریب ہو کر ہی قوم و ملک کی خدمت انجام دی جاسکتی ہے۔

مندرجہ بالاسطور میں یہ حقیقت روشن ہے کہ انگریزوں کے غلبہ پانے کے بعد ہندوستان میں بلا تفریق مذہب و ملت ردعمل کے طور پر ایسی تحریکیں زور پکڑتی چلی گئیں جنہوں نے احساس قومی کو بیدار رکھا۔ ان تحریکوں کا اثر ہی تھا جس نے صرف اٹھارہ برسوں کے بعد یعنی ۱۸۸۵ میں کانگریس پارٹی قائم کر دی۔ یہ پارٹی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ہے۔ ابتداء میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں فرقوں نے شانہ سے شانہ ملا کر غیر ملکی حکومت کے خلاف جنگ کی اور بہت جلد پنجہ استھصال سے رہائی پانے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں یہ لکھنا بے محل نہ ہوگا کہ مسلم لیگ کے بانی محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کا آغاز بھی کانگریس

ہی سے ہوا ہے۔ آغاز میں کانگریس کی آواز ست رہی مگر رفتہ رفتہ اس میں قوت و توانائی پیدا ہوتی چلی گئی۔ ملک کے سماجی، ثقافتی، تہذیبی، تعلیمی، دینی و مذہبی تحریکوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے جن کو عموماً اور کانگریس کو خصوصاً اچھی نظر سے انگریزوں نے نہیں دیکھا۔ ان کے خیال میں یہ خطرے کی گھنٹیاں تھیں۔ اس لئے انہوں نے ہر اس موقع کا استعمال کیا جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور نفاق پیدا ہو سکتا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اعجاز حسین کا خیال ہے:

” مختلف اداروں کے علاوہ جو پہلے سے موجود تھے ۱۸۸۵ میں کانگریس کا قیام ہوا۔ اس کا مطیع نظر قومی و سیاسی تھا۔ شروع میں مطالبات کی لے دیئی رہی مگر رفتہ رفتہ اس کی قوت اور آواز میں جان آتی گئی۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی ترقی میں ان کو اپنی حکومت خطرے میں نظر آئی۔ ان کو ضروری معلوم ہوا کہ لوگوں میں نفاق کی لہر تیز تر کر دی جائے۔ ہندو مسلم کا اتحاد مجرور کیا جائے۔ چنانچہ حکومت نے سیاسی معانج کی بناء پر ہندو مسلمان میں اختلاف کا زہر مختلف محاذ پر تیزی سے پھیلانا آئیں حکومت سمجھا۔“ ۱

ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق کے زہر کو تیزی سے سراحت کرانے کے لئے لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ میں بنگال کو مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ہندوؤں نے اس تقسیم کو مسلمانوں کی پاسداری خیال کیا اور اپنے حق میں مضر گردانا۔ مسلمانوں نے اس تقسیم کا اس لئے خیر مقدم کیا کہ مشرقی بنگال میں ان کی اکثریت تھی۔

لیکن اسی سال سے قومی بیداری اور ملی شعور کا جذبہ ہندوستان میں تیز تر ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے سیاسی شعور میں بیداری آئی۔ کھلم کھلا انگریزوں کی مخالفت

۱۔ اردو شاعری کا سماجی پس منظر از ڈاکٹر اعجاز حسین

کرنے کا جذبہ بنگال سے نکل کر سارے ہندوستان میں عام ہوا۔ سودیشی تحریک اور بدیسی مال کے بایکاٹ کی تحریکیں چل پڑیں۔ ہندوستانیوں نے انگریزی حکومت اور انگریز افسروں کے خلاف برس رعام بولنا شروع کیا، اگرچہ ابتدا میں انگریزوں کو بنگال کی تقسیم سے سیاسی فائدے حاصل ہوئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اس بات کو لے کر فسادات بھی ہوئے مگر آخر کار ان کو عوامی مطالبے کے آگے جھکنا پڑا۔ یعنی جس بنگال کو چھ برس پہلے تقسیم کیا تھا اس کو ۱۹۱۱ میں دوبارہ متعدد کرنا پڑا۔

ہندوستانی قومیت کی یہ پہلی کامیابی بہت حوصلہ افزائنا تابت ہوئی۔ اس نے لوگوں کے دلوں کو برمایا۔ ان کے جوش و خروش کو بڑھایا۔ بایکاٹ، جلوس، تحریک اور جلسے مظاہرے کی طاقت کا یقین دلا یا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماجی، اقتصادی، تعلیمی، سیاسی، دینی، مذہبی اور ملی کاموں کی عزت بڑھی۔ لوگ جو ق در جو ق اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ ایک سال کے اندر یعنی ۱۹۰۶ میں سلف گورنمنٹ کا مطالبہ انگریزوں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ انگریزوں نے بعض مراعات بخشنده کے طور پر دے کر قومی بیداری اور ملی شعور کے جذبے کو تھپک تھپک کر سلانا چاہا۔ منشو مارے اسکم کے تحت ۱۹۰۶ میں اعلیٰ عہدوں اور انڈیا کونسل کی ممبری کے دروازے ہندوستانیوں پر اسی خیال کے تحت پہلی دفعہ واکیے گئے۔ ان اقدامات نے لوگوں کے حوصلے بڑھائے۔ ان کی نظر میں وسعت پیدا کی اور انہیں کامیابی سے سرفراز کیا۔ ان باتوں اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والی چند دیگر باتوں نے انگریزوں کے خلاف بھڑکنے والی آگ کو ہوا دی۔ بین الاقوامی سطح پر جس بات نے لوگوں کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت کے جذبے کو بڑھانے میں زخم پر نمک کا کام کیا وہ ہے جنوبی افریقہ میں انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ ناروا اسلوک۔ لہذا اعلیٰ عہدوں اور انڈیا کونسل کی ممبری کی لائچ سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا بلکہ بہت تھوڑے دنوں کے اندر یعنی ۱۶۔ ۱۹۱۵ میں سلف گورنمنٹ کا مطالبہ زیادہ شد و مدد سے ہوم روں کی شکل میں پیش ہوا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہوم

روں کا مطالبہ پیش کرنے میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کی یہ صورت اس لئے سامنے آئی کہ مسلمان بھی ترکی کو لے کر انگریزوں سے بدبخت تھے۔ انگریزوں کی حکومت سے نجات پانے اور آزادی حاصل کرنے کے جذبے میں روز بروز تیزی آتی گئی۔ تین سال کے اندر ہی اندر ۱۹۱۸ کے سالانہ اجلاس میں کانگریس نے ایک قدم اور بڑھ کر ہندوستان کو نو آبادی مملکت کا درجہ دینے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دورانِ انتشار میں حکومت برطانیہ نے اس تجویز کو بلا تامل منظور کر لیا اور بہت سی سہوتیں اور حقوق دینے کا اعلان بھی کیا مگر اسی دوران جلیانوالہ باعث کا دردناک اور خونی واقعہ پیش آگیا۔ اسی وقت مسئلہ خلافت اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ ۱۹۱۹ میں انگریزوں کی مخالفت میں ایسی زبردست ہڑتاں ہوئی کہ اس کی نظریہ نہیں ملتی۔ ۱۹۲۰ میں ان حالات کے پیش نظر گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک شروع کر دی۔ خان بہادر، رائے بہادر، سر اور دوسرے تمام خطابات جو سرکار برطانیہ نے ہندوستانیوں کو اعزاز کے طور پر دیئے تھے دھڑک دھڑک واپس ہونے لگے۔ عدالتوں اور کوسلوں کا عام بائیکاٹ ہوا۔ قانون بخشنی اور جیل جانے میں اب ذلت کے بر عکس عزت محسوس کی جانے لگی۔ ہندوستان کی سیاسی کیفیت میں بڑی سرعت سے تبدیلی ہو رہی تھی، ۱۹۲۸ میں مزدوروں کی ایسی زبردست ہڑتاں ہوئی کہ بغاوت قرار پائی۔ خاص خاص اور اہم لیڈروں کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اسی وقت میں الاقوامی سٹھ پر دوسری جنگ عظیم کی شکل میں زبردست بھونچاں آیا۔ برطانیہ کی وجہ سے ہندوستان بھی اسی کی زد میں آگیا۔ حکومت برطانیہ کی پالیسیوں کے برخلاف کانگریس اور دوسری جماعتوں نے اس جنگ میں انگریزوں سے عدم تعاون کا اعلان کر دیا اور ملک چھوڑو کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ۱۹۳۲ میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان مصالحانہ کوشش کے لئے وزیر اعظم چرچل نے سراستو کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ کرپس ناکام واپس گئے۔ ۱۹۳۵ کے الیکشن میں وزیر اعظم

چرچل شکست کھا گئے۔ لیبر پارٹی کے سربراہ اٹلی نے عنان حکومت سنہجاتی۔ اس نے وسعت نظر کا ثبوت دیا۔ ہندوستانیوں کو قانون سازی کا حق دیا۔ صرف ہندوستانیوں پر مشتمل قانون ساز بنانے کا وعدہ کیا لیکن آئین نظام بننے تک اہم سیاسی جماعتوں کے ارکان پر مشتمل گورنمنٹ بنانے کا اعلان کیا۔ واسرائے نے کانگریس اور مسلم لیگ کو اس کام کے لئے مدعو کیا۔ کانگریس نے دعوت قبول کی اور مسلم لیگ نے اس کو رد کر دیا۔ کانگریس کے دعوت قبول کرنے کو مسلمانوں نے اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کی حکمت عملی کا رگر ہوئی۔ دونوں فرقوں میں نفاق اپنے عروج پر آگیا۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی فضا میں زہر گھل گیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۶ میں کلکتہ نواکھالی اور بہار میں شدید فرقہ وارانہ فساد برپا ہوا۔ ہندوستان کی سیاسی حالت میں تیزی سے آنے والی تبدیلیوں کے پیش نظر وزیر اعظم اٹلی نے اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۷ تک ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے گی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندوستان کے لئے اور ۱۳ اگست ۱۹۴۷ پاکستان کے لئے وہ سنہرادر ثابت ہوا جس کی آرزو میں ہزاروں لاکھوں انسانوں نے جان کی قربانی دی تھی۔ ہر قسم کے جبر و ستم کو ہنسی بہنسی برداشت کیا تھا اور خنداب بلب پھانسی کے پھندوں پر چڑھ گئے تھے۔ یہ ہے دو انقلابوں کے درمیانی مدت کی مختصر تاریخ، تقریباً نوے برسوں کی سیاسی، معاشری، تہذی اور معاشرتی تاریخ کا یہ بہت ہی محمل خاکہ ہے لیکن ان ہی پوشیدہ اشاروں میں ہندوستان کا دل دھڑکتا ہے۔

یہ بات بالکل مسلم ہے کہ ۱۸۵۷ سے ۱۸۷۷ تک ہندوستان میں سیاسی، سماجی معاشری، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا براہ راست اثر اردو شاعری پر ہوا۔ ولی کی تباہی ایک شہر کی تباہی نہ تھی بلکہ ایک تہذیب ایک معاشرت کی تباہی تھی۔ داغ اور غالب نے تو اس کا سوگ کیا ہی ان کے بعد جو شعر اگزرے انہوں نے بھی اس کی بر بادی کا ماتم منایا۔ مثی نمونہ از خردوارے کے طور پر چند اشعار نقل کرتی ہوں۔

جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا
عجیب حال دیگر گوں ہے دلی والوں کا



کوئی مراد جو چاہی حصول ہی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول ہی نہ ہوئی
—دانگ



چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زندگی کا



رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زبان کوئی نہ ہو
— غالب



یہ کسی نے ظلم بھی ہے ساکہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گناہ
و لے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی ان کے دل میں بخار ہے
— ظفر



نعم و فیاض ہیں محتاج نان خشک کے
خاک روپوں کو میسر خوان انواں ہو تو کیا
— منیر شکوہ آبادی

انگریزوں کی بربیت اور وحشیانہ سلوک سے ہندوستان کی معاشرت کا شیرازہ جس طور بکھرا اس کا تھوڑا بہت اندازہ تو غالب، داغ، ظفر اور منیر شکوہ آبادی کی شاعری سے ہوتا ہے لیکن اس بکھراو کا اثر کچھ دنوں بعد زیادہ بھیانک شکل میں ظاہر ہوا۔ ہندوستانی عام طور سے اور مسلمان خاص طور سے اخلاقی پستی، بے ہمتی، بزدی، احساس کمتری، ذلت خواری اور نان شبینہ کی محتاجی میں گرفتار ہوئے۔ حال کے موجز راسلام میں معاشرت کی اس بربادی کی بہت خوبصورت تصویر ملتی ہے۔ انہوں نے ہر جماعت، ہر گروہ، ہر پیشہ اور طبقہ کے لوگوں کی اخلاقی پستی کی متھر ک تصویریں مسدس میں پیش کی ہیں۔ دینی رہنماؤں کا حال ملاحظہ فرمائیے۔

بہت لوگ پیروں کی اولاد بن کر نہیں ذات والا میں کچھ جن کے جوہر بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر کہ تھے ان کے اسلاف مقبول داور کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے امرا و شرفا کی کیفیت دیکھیں۔

سمجھتے ہیں سب عیب جن عادتوں کو بہائم سے نبت ہے جن سیرتوں کو چھپاتے ہیں او باش جن خصلتوں کو نہیں کرتے اسلاف جن حرکتوں کو وہ یاں اہل دولت کو ہیں شیر مادا نہ خوف خدا ہے نہ شرم پیغمبر

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ کے انقلاب کے بعد کسب معاش اور اکتساب فن کے طور طور یقہ میں زبردست تبدیلی آئی۔ قدیم طرز فکر اور طرز زندگی اس سے لگا و نہیں کھاتی تھیں۔ نیا معاشرہ جو ابھر رہا تھا اس سے موافقت، موافق اور مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔ سر سید گھر میں لگی آگ دیکھ کر اسی باعث

ہمایوں کو مدد کے لئے بلا رہے تھے۔ حالی اسی نقطہ نگاہ سے شعر و ادب کو اخلاق اور افادیت سے متعلق کرنا چاہتے تھے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان حضرات کی محنت شاقہ اور سعی بلیغ سے نئی معاشرت کو قبول کرنے میں بڑی مدد ملی۔ لیکن اس کا ایک تاریک پہلو یہ بھی سامنے آیا کہ لوگ انگریزوں کے وضع قطع، لباس و آرائش، آداب نشست و برخاست، طرز تکلم ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے۔ اکبر اور شبلی نے اس ذہنیت کی کھلی مزمت کی اور مشرقی وقار کو برقرار رکھنے کی انتہک کوشش کی۔ ان حضرات کو سرید سے اختلاف اسی بنا پر تھی۔ اکبر کے چند اشعار دیکھیں۔

لیلی نے سایہ پہنا مجنوں نے کوت پہنا
ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بہ دستور اپنی جگہ ہیں لیکن
ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

لیکن انہی تقلید پرستی سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو نیا معاشرہ اپنے ساتھ بہت کچھ انعام و اکرام بھی لا یا۔ سب سے بڑا انعام تو یہ ہے کہ اس نے سامنی نقطہ نظر بخشنا اور انگریزی زبان و ادب کی راہ سے روشنیوں کا ایک سیلا بہم تک امنڈ آیا۔ اس روشنی میں اردو زبان و ادب اور شعرو شاعری نئی قدروں اور صالح تجربوں سے ہم کنار ہوئی، اردو نشر سامنی، منطقی، صاف، براہ راست اور روای ہوئی۔ اردو شاعری کی چھان پھٹک کی گئی۔ ان اصناف شاعری کی طرف توجہ ہوئی جو معاشرے میں صالح اقدار پھیلانے کے قابل تھیں۔ نظم، افسانہ، ڈرامہ، تقید، تاریخ، سوانح نگاری اور دیگر علمی، مذہبی، سماجی، اقتصادی اور سامنی علوم کو فروغ ہوا۔ انگریزی نظموں افسانوں اور دیگر شاہکاروں کا اردو میں ترجمہ ہوا۔ نیچرل شاعری کی طرف خصوصی توجہ ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے انہم پنجاب کے تحت ایسے مشاعرے منعقد کئے جس میں مصرع طرح کی بجائے نظم کے عنوانات دئے جاتے تھے۔ چنانچہ حالی، نظم طباطبائی، نادر کا کوروی، درگا سہائے سرور، اکبر الہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، عبدالحیم شرر، اقبال، چکبرت

عظمت اللہ خان وغیرہ نے اس تجربے کو روایت کی شکل دی۔

اس عہد میں سر سید، شبلی، اکبر اور حاملی کے بعد اقبال کی شخصیت وہ ذات تنہا ہے جس نے اپنی فکر بے پایاں سے اپنے ہم عصر اور بعد میں آنے والی نسل کو روشنی دکھائی۔ اس کے بعد جوش، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، مخدوم مجی الدین، ساحر لدھیانوی اور دوسرے شعراء نے کب نور کر کے زندگی اور شاعری کی شبستان میں رنگ و رونگ بھرا۔ ساحر اور جوش نے اپنی نوائے شاعری میں استمایت کا رنگ بھی ملا۔ فکر و فن کا یہ امتزاج نہ صرف یہ کہ آزادی کے قبل مقبول ہوا بلکہ آزادی کے بعد بھی ایک عرصہ دراز تک اس کے جذب و کشش میں کمی نہ آئی۔ ہاں کبھی کبھار کوئی آواز ایسی بھی کانوں میں پڑی جوتی پسند شعرا سے قدرے مختلف ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا مگر دنکڑوں میں تقسیم ہوا۔ ہندوستان کے چند حصوں کو الگ کر کے ایک نیا ملک پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ اس تقسیم کے رد عمل میں جو خوب ریزی ہوئی وہ بہت ہی وحشتناک، دردناک اور ما یوس کن ہے۔ گاندھی جی اور علی برادران کی محنت شاقہ سے بنی صلح و آشتی اور برادرانہ تعلقات کی دیوار زمین پر آگئی۔ لاکھوں کروڑوں انسان ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت کر گئے۔ مہاجرین کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ ان کی آباد کاری کا مسئلہ درپیش ہوا۔ ہندو جو پاکستان میں رہ گئے اور مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے ان کے حفظ و امان کا مشکل مسئلہ سامنے آیا۔ ان باتوں نے ہندوستانی قومیت کے تصور کو چکنا چور کر دیا۔ نوئے برس قبل مسائل دوسرے تھے اور آج کے مسائل دوسرے تھے۔ اس وقت غیروں کے ہاتھ ہم لئے تھے آج اپنوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ یہ غم ایسا ہے جو بھلانے نہیں بھولتا۔ اپنے غیر کی طرح بول رہے تھے۔ داد و فریاد کرنے کے پاس جائیں۔ یہ تھا آزادی کے بعد کے معاشرے کا سب سے بڑا سوال۔ اردو شعرو ادب میں ان تمام باتوں کی کمک محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ ابتدا میں تو بعضوں نے ایسی خون سے رنگی آزادی کو آزادی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
فیض۔

نوحہ خواں آج نہ کس طرح بول آزادی کے
کھیلیں کیا خود ہی کھلو نے ہیں یہ بربادی کے
جمیل مظہری۔

ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان دو مختلف طریقہ سے لی گئی۔ یہاں اس کو جان کے لائے پڑے۔ وہاں یہ قومی، سرکاری اور ثقافتی زبان قرار پائی۔ دونوں ملکوں میں اس کی ترقی و ترویج مختلف انداز سے ہونے لگی۔ اردو زبان اور ہندوستان کے بعض اہم شعرا و ادبای کا یک پاکستان کے اہم شاعر و ادیب قرار پائے۔ حفیظ جالندھری نے پاکستان کا قومی نغمہ لکھا۔ ان کی اہمیت نغمہ زار، شاہنامہ اسلام اور سوز و ساز کے شاعر کی حیثیت سے کم اور قومی ترانہ لکھنے والے شاعر کی حیثیت سے زیادہ سمجھی گئی۔ اردو رسائل و جرائد کی درآمد و برآمد پر ہندوستان اور پاکستان میں پابندی لگی۔ شعر و ادب کو جغرافیائی حدود میں قید کرنے کی اس سے اچھی مثال نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ بعض مسائل دونوں ملکوں میں الگ الگ بھی نظر آتے ہیں۔ نئے ملک کو معاشری، معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی، عسکری اور دوسری سطھوں پر بعض ایسے مسائل سے دو چار ہونا پڑا جو ہندوستان میں کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ ملک بننے سے لے کر آج تک پاکستان ان قوانین اور اصول کی تلاش میں لگا ہے جو اس کو ایک طاقتور اور ترقی پذیر ملک کی فہرست میں جگہ دلا سکے جبکہ ابتداء ہی سے ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں مضبوطی سے زمین میں پیوست ہیں۔ پاکستان میں حکومتیں بدلتی ہیں اور انقلابات آتے ہیں جبکہ ہندوستان میں کئی کئی پنجالہ منصوبے عمل درآمد سے گزر کر فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ اس کے

علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین دو جنگیں بھی ہوئیں۔ آخری جنگ کے نتیجے میں اس کا ایک حصہ اس سے الگ ہو کر آزاد مملکت کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ یہ ہے آزادی کے بعد کا عہد جس میں اردو شعر و ادب نے ترقی و ارتقا کا سفر طے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کے اثرات اردو شعر و ادب پر بہت ہی واضح طور پر مرسم ہوئے ہیں۔

اس سے قبل کہ میں اس موضوع کو سمیئوں اتنی سی بات اور کہنا چاہتی ہوں کہ یہ بہت خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ اردو زبان و ادب نے نہ صرف یہ کہ عہد بہ عہد کے حالات کا ساتھ دیا ہے بلکہ اس نے اپنے دامن کے چاند ستاروں کو بھی قربان کرنے سے گریز نہیں کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر نے جنگ آزادی کا جو طبل بجا یا تھا اس کی دھمک منیر شکوہ آبادی، محمد علی جوہر، ظفر علی خان، حضرت مولانا موسیٰ مولانا ابوالکلام آزاد اور بہت سے دوسروں کے دل کو گرماتی ہوئی آج بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ انسانیت پر جب بھی جور و جبر کا بازار گرم ہوا ہے اردو شاعر و ادیب نے اپنی ذمہ داری بطور احسن انجام دی ہے۔ واقعات، حالات، حادثات، تغیرات، تصادمات، تعصبات، تسامحات، تصورات، تفکرات اور تحلیلات کی ان ہی لالہ کاریوں سے وہ عہد عبارت ہے جس میں حفیظ جالندھری نے زندگی بسر کی ہے اور فکر و فن کی شمع کے لئے روشنیاں لی ہیں۔

* * *

نظم نگاری

حفیظ جالندھری نے نغمہ سنجی اس وقت شروع کی جب اردو شاعری میں اقبال کی دھوم پھی ہوئی تھی۔ اردو شاعری میں اقبال کی آواز سب سے جدا گانہ اور مختلف ہے۔ اس میں فکر و فن کا امتزاج اس تناسب اور ترتیب سے ہے کہ اس کی دلکشی اور دلفریبی بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے اثر و نفوذ سے آج تک اردو شاعری اپنے کو آزاد نہیں کر سکی۔ حالانکہ ان کے حامیوں کے ساتھ مخالفوں کی بھی ایک بڑی جماعت ہے۔ اقبال سے متاثر ہو کر جوش ایک خاص قسم کی شاعری کر رہے تھے اور دوسری طرف اختر شیرانی محبت کے نغمے الاپ رہے تھے۔ شاعری کے اس رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فراق گورکچوری نے ایک تقریر میں کہا:

”جب ۱۹۳۵ میں حفیظ جالندھری کا پہلا مجموعہ نغمہ زار کے نام سے شائع ہوا تو اکبرالہ آبادی، چکبست اور اقبال کا کلام ملک بھر میں مشہور ہو چکا تھا۔ اس وقت اکبر اور چکبست کے کلام اپنا نیا پن کھو چکے تھے یا کھو رہے تھے۔ اقبال کے کلام کا زور اور غلغله بڑھ رہا تھا اور جوش ملٹح آبادی کے کلام کی دھوم بندھ رہی تھی۔ اختر شیرانی کی رومانی نظمیں دلوں میں چنکیاں لینے لگی تھیں۔ پنجاب میں تلوک چند محروم کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تھے اور وہ ایک خاص شہرت کے مالک ہو چکے تھے۔ ہمارے صوبے میں

جو ش کو چھوڑ کر اس وقت جو شعر بھی بلند مقامات پر پہنچ چکے تھے وہ سب کے سب غزل گو تھے یعنی حسرت موبانی، فانی بدایونی، یگانہ، اصغر گونڈوی اور جگر۔ ان کے علاوہ جن دس بارہ شاعروں نے شہرت حاصل کی ان سب کا نام اور کام ۱۹۲۵ سے ادھر کی چیزیں ہیں۔^۱

نغمہ زار کے بعد حفیظ جالندھری نے سوزوساز، تلخابہ شیریں، شاہنامہ اسلام، ہندوستان ہمارا، پھول مala وغیرہ شائع کیں ان مجموعہ ہائے کلام میں نظمیں بھی ہیں، غزلیں بھی، گیت بھی، بچوں کی نظمیں بھی، نعتیں بھی اور شاہنامہ اسلام یعنی مثنوی بھی۔ قیام پاکستان کے بعد قومی ترانہ تخلیق کرنے کا اعزاز بھی ملا۔ اس کے علاوہ شاعری کی راہ سے کئی طرح کے انعامات، اعزازات اور عنایات ہوتی رہیں۔ ۱۹۶۳ میں ماہنامہ افکار، لاہور نے جوش نمبر شائع کرنے کے فوراً بعد حفیظ نمبر شائع کیا۔ ان کمالات پر خود حفیظ نے تعلیٰ کی ہے۔ ماہنامہ نقوش لاہور کے آپ بیتی نمبر میں رقم کیا ہے۔

عرض ہند ہی وجہ شکایت ہو گئی چھوٹا سا منھ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی یاروں کی بہمی پہنسی آگئی حفیظ یہ مجھ سے ایک اور بڑی بات ہو گئی آگے رقم کرتے ہیں:

”آج پاکستان کا بلال امتیاز ہوں اور پرائمڈ آف پروفورمنس بھی۔ پاکستان سے پہلے غیر ملکی حکومت نے خان بہادر سے مخاطب فرمائیا منھ بند کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ اپنی وطنی ریاستوں نے ملک اشرا اور نواب حسان الملک بہادر بھی بنادیا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے ادبی جلسے میں سجاد حیدر یلدرم نے علی الاعلان مجھے اردو کا بنسری بجا اور اسلام کا شہنائی نواز بھی قرار دیا تھا۔ قوم، ملک و ملت اور فردوسی اسلام

^۱ حفیظ جالندھری، تقریب از فرقہ گورکھپوری، نشریہ آل انڈیا ریڈ یو، لکھنؤ، اگست ۱۹۳۱

اور شاعر پاکستان اور نہ جانے کن اعزازات کے ساتھ نوازتے ہی چلے
جاری ہے ہیں۔^۱

لیکن اردو ناقدوں کی طرف نگاہ سمجھئے یا حفیظ نمبر کا غائر مطالعہ کیجئے تو یہ محسوس
کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی کہ وہ درخور اعتنا نہیں قرار دئے گئے۔ حفیظ نمبر کے شرکا میں
اردو کے بڑے ناقدوں کے نام نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ یوں بھی ان کے مضامین حفیظ کی
شخصیت اور فن سے متعلق کہیں نظر نہیں آتے۔ ناقدوں کی طرف سے بے اعتمانی اور بے توجیہی
کا یقین خود حفیظ کو ہے۔ حفیظ نمبر کی اشاعت سے پہلے صہبائکھنوی مدیر افکار، لاہور کے خط
کے جواب میں جو خط حفیظ نے لکھا ہے اس سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھا ہے کہ جوش
نمبر کے لئے جن اہل قلم کا تعاون آپ کو ملا ہے۔ ان کا تعاون حفیظ نمبر کے لئے نہیں ملے گا
اگرچہ ملاقاتیں دوستیاں، یارانہ سکھوں سے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر لوگ میرے کلام کو
پسند بھی کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

”دیکھئے جوش نمبر کے لئے لکھنے والے جو بزرگ ہیں اس طرز
کے لوگ حفیظ نمبر کے لئے لکھنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً بقول آپ کے
میری سب سے یاد اللہ ہے۔ ان میں سے اکثر اہل نظر بھی ہیں۔ اسلوب
بیان کی نزاکتوں اور زبان کی انوٹوں کو جانے والے بھی ہیں۔ میری تحسین
بھی فرماتے ہیں لیکن یہ نہ بھولئے کہ جہاں مقصدیت کم ہو لیکن پرانہ جذبہ
تربيت و طینت وافر ہو وہاں کندہم جنس باہم بہم جنس پرواز کا نقش ہر عالم
پیدا ہو یہار ہتا ہے۔“^۲

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ کو اپنے ترقی پسند شاعروں ادیبوں اور ناقدوں
سے شکایت ہے۔ حالانکہ ریاست خیر پور میں ملازمت کے دوران انہوں نے مشہور نظم رقصہ

^۱ حفیظ نمبر، ماہنامہ افکار، لاہور، شمارہ ۳۶۵-۳۶۳، صفحہ ۲۸-۲۷

لکھی جو جا گیر دارانہ طرز معاشرت پر ایک گہرا اظر ہے۔ اس نظم کو پڑھنے کے جرم میں وہ گرفتار ہوئے اور ملازمت سے بر طرف بھی۔ یہ صحیح ہے کہ حفیظ کی شاعری میں اس کی فکر کے خطوط واضح مستقیم نہیں بناتے بلکہ مثلث، مرلع، دائرہ، زاویہ سب بناتے ہیں۔ عظیم اور بڑی شاعری اسی طرح وجود میں آتی ہے۔ شاعر اور فنکار کے ذہن و دماغ کو حصار میں بند کر کے فن اور فنکار کے ساتھ ہم نہ تو انصاف کرتے ہیں اور نہ کوئی بہتر سلوک۔ اشتراکی ممالک میں جہاں اس بات پر خاص دھیان دیا جاتا ہے کہ فن اور فنکار مخصوص دائرے اور حصار سے باہر نہ نکلیں وہاں بھی اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگی ہیں۔ لیکن میرے ایسا کہنے سے یہ نتیجہ نہ نکلا جائے کہ میرے نزدیک بڑی اور عظیم فنکاری کے لئے مقصد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ میری غرض و غایت صرف یہ ہے کہ مقصد کے دائرے اور حصار خود فنکار کو تلاش کرنے دئے جائیں اور اس پر قید و بند نہ لگائی جائے۔ آخر فنکار اور شاعر کی فکر پر اس قدر شک کرنے کی کیا وجہ ہے کہ جب اس کو آزاد چھوڑا جائے گا وہ انسانیت، محبت، ہمدردی، خلوص، عدل، انصاف اور بہتر زندگی کے منافی خطوط پر ہی رقص کرے گی۔ میر، انیس، غالب، نظیر اور اقبال سے کسی نے یہ مطالبات نہیں کئے اور انہوں نے فن اور فنکاری کے چمن زار کھلائے۔ اس لئے حفیظ کے مندرجہ بالا بیان میں مقصدیت کی جو بات ہے وہ ضرور ترقی پسندی کے مترادف ہے ورنہ میرے خیال میں بے مقصد فنکاری کے نمونے پیش کرنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ جتنا مقصدی شاعری اور فنکاری میں مشکلیں اٹھا کر قطرہ کو گہر میں ڈھالا جاتا ہے۔ اس بحث و تجھیس سے میرا مفہوم یہ ہے کہ حفیظ کی شاعری بے مقصدی نہیں ہے اور نہ اس پر افسوس کرنے کا کوئی موقع ہے لیکن اس بات کا کیا کیا جائے کہ شاعری اور فنکاری میں گروہ بندی کا روایج زوروں میں چل نکلا ہے۔ اس کی وجہ سے اکثر اوقات بعض فنکاروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاتا۔ ذوق، غالب کا معاملہ ہمارے سامنے ہے۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین نے حفیظ سے متعلق ناقدوں کے رویے سے ایک طرح کی

بیزاری ظاہر کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

”میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو انہیں صرف شاہنامہ اسلام کا
شاعر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہیں حفیظ کا نام صرف ایسی
نظموں کے ساتھ یاد ہے جیسے اپنے من میں پریت بسائے، رقصہ اور ابھی
تو میں جوان ہوں۔ کچھ ان کے طرز شعر خوانی ہی کو ان کا سب سے بڑا
کمال قرار دیتے ہیں۔ کچھ ان کی غزلوں میں جذبات کی عمومیت اور انطباق
کی برجستگی پر فریفہ ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اور کچھ نہیں اگر صرف ان تمام
پسندیدگیوں ہی کو جمع کر دیا جائے تو کیا بلند پایہ شاعر کی بہت سی خوبیاں یکجا
نہیں ہو جاتیں۔“ ۱

حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کے علاوہ تین مجموعے نغمہ زار، سوز و ساز اور
تلخابہ شیریں شائع کئے ہیں۔ ان میں نظمیں، غزلیں اور گیت ہیں۔ نغمہ زار میں ستہ نظمیں،
گیتوں کے علاوہ سوز و ساز میں تینتیس اور تلخابہ شیریں میں چھیس نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ
ہندوستان ہمارا کی اکتنیں، پھول مالا کی بیتیں اور تہجد کی نماز کی نظموں کو شامل کر لیا جائے تو
محسوس ہوگا کہ حفیظ نے تعداد کے لحاظ سے نظموں کا اچھا خاصہ سرمایہ اکٹھا کیا ہے مگر ناقدوں
کی توجہ صرف دو چار نظمیں ہی اپنی طرف کھیچنے سکیں۔ ملک اسماعیل حسن خان نے حفیظ کی مشہور
نظموں کے متعلق لکھا ہے:

”ان کی مشہور نظمیں، ابھی تو میں جوان ہوں، رقصہ، جاگ سوز
عشق جاگ، پریت کا گیت، میرا سلام اور فرشتوں کا گیت ہیں“ ۲

آخر کیا وجہ ہے کہ ناقدوں کی نگاہ میں حفیظ جالندھری کی چند نظمیں ہی اچھی ہیں۔
اس سوال کی گہرائی میں جائیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظموں کو تین الگ الگ خانوں میں

۱۔ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خاں، جمالستان، دہلی، مارچ ۱۹۶۵، صفحہ ۶

تفصیل کر دیا گیا ہے: (۱) عام نظمیں (۲) گیت (۳) بچوں کی نظمیں۔ اس طرح کی تقسیم کر کے لوگوں نے ان کو گیتوں کا کرشن کہیا اور بچوں کی نظمیں کے خالق کی حیثیت سے عدیم المثال فنکار اور شاعر خوش نوا کہا ہے۔ ان باتوں نے ان کو شہرت اور مقبولیت تو بخشی مگر ان کی فنکاری پس پشت پڑ گئی۔ ناقدوں اور اہل نظر نے ان کی شاعرانہ خوبیوں اور خامیوں کی طرف توجہ نہیں کی۔ خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کا لفظ میں قصدًا استعمال کر رہی ہوں۔ خامیوں کی گرفت ہونے سے شاعر اور فنکار کو اپنے فن میں اصلاح کرنے کا موقع ملتا ہے، مگر جس کی فنکاری کی طرف سے یک لخت بے توجہی بر قی جاتی ہے اس کو اس کا موقع نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ حفیظ کی شاعری سے متعلق مضمایں کم یاب ہیں۔ مندرجہ بالاسطور میں اردو کے ناقدوں، اہل نظر، صاحب بصیرت اور اویب و شاعر دوستوں سے حفیظ کو جوشکایت رہی ہے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ ملک اسمعیل حسن خاں نے اگرچہ ناقدوں کی بے توجہی کی طرف اشارہ ان لفظوں میں کیا ہے:

”حفیظ جالندھری بیسویں صدی کے بہت پرانے شاعر ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام نغمہ زار ۱۹۲۵ میں شائع ہوا لیکن اس وقت اردو دنیا نے ان کی آواز پر غور نہیں کیا۔ شاید اس میں اسے کوئی نئی بات یا نیا مزہ نہیں ملا۔ لیکن حفیظ اسی طرح شاعری کرتے رہے اور شاعروں میں اپنی آواز اور ترجمہ کی وجہ سے انہوں نے مقبولیت حاصل کی لیکن کسی نے ان کے کلام کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میری نظر سے ابتدائی تیس عیسوی سے ترکھ عیسوی تک کے متعدد رسائل اور جرائد کی جتنی فائلیں گزریں ان میں حفیظ پر براۓ نام تنقیدی مضمایں نظر آئے۔ لوگوں نے اس طرف توجہ نہیں کی، ان کی شاعری کو غالباً درخور اعتنا نہیں سمجھا۔“^۱

¹ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خاں، جمالستان، دہلی مارچ ۱۹۶۵، صفحہ

مگر حفیظ کی شاعری کا جائزہ لے کر جو تیجہ برآمد کیا ہے وہ کمس مختلف ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

”مختصر یہ ہے کہ حفیظ اپنے نظریات و تصورات کے لحاظ سے دوسرے گروپ کے شعرا سے بھی پچھے ہیں۔ نظریات و تصورات میں جو کچھ تغیر ہوا ہے وہ اس سے یا تو واقف نہیں ہیں یا ان پر غور نہیں کرتے۔ ان کا مطالعہ نہ وسیع ہے نہ گبرا۔ انہوں نے اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو زمانہ کی تازہ ہواوں کی رو پر کھلانہیں رکھا۔ سماجی شعور کی جھلکیاں ان کے یہاں بس کہیں کہیں پر ملتی ہیں وہ بھی انتہائی مبہم و غیر متعین و غیر منظم۔“^۱

بہر حال مندرجہ ذیل سطور میں حفیظ کی مشہور نظموں اور بچوں کے لئے لکھی گئی نظموں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا اور ان کی فنکاری اور صنائی پر روشی ڈالی جائے گی۔ آغاز سخن کے طور پر میں نے رقاصلہ نظم کو منتخب کیا ہے۔ اس نظم کو عام طور سے اہل نظر اور صاحب بصیرت نے اچھی نظم کہا ہے۔ اس میں جا گیردارانہ نظام کی خرابی اور خامی کی ایک جھلک بھی ملتی ہے۔ بظاہر اس میں نوبند ہیں مگر ایک سرسری نظر بھی اس حقیقت کو فاش کرتی ہے کہ دراصل اس نظم میں چار مناظر ہیں۔ پہلا منظر رقاصلہ کے پُر کیف رقص سے متعلق ہے، دوسرا رقاصلہ اور شریف دو شیزہ کے مقابلہ و موازنہ سے، تیسرا ملت بیضا کی زبوں حالی سے اور چوتھا اپنے حال میں مست اور صابر و شاکر بننے کی تلقین سے۔ پہلے دوسرے اور تیسرا حصے میں ایک ربط ہے مگر چوتھے حصے کو ماقبل کے بندوں سے ہم سلک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے دوسرے اور تیسرا حصہ میں رقاصلہ کی آڑ میں شاعر نے جو باتیں کہیں ہیں وہ اس کو بعض مصالحتوں کے خلاف معلوم ہوئیں اور یہاں کیا ایک اس نے پہلے کبھی گئی باتوں کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے چوتھا منظر پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ نظم اپنے نقطہ عروج اور

¹ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خاں، جمالستان، دہلی مارچ ۱۹۶۵، صفحہ ۱

زور مکملہ سے محروم رہ گئی ہے۔

نظم کا پہلا بند ہے۔

انھی ہے مغرب سے گھٹا پینے کا موسم آگیا
ہے رقص میں ایک مہ لقا
نازک ادا ناز آفریں

آغاز بہت ہی براہ راست ہے۔ ٹوپوگرافی کے طور پر صرف ایک شعر ہے جس میں
مغرب سے گھٹا کے انٹھنے اور پینے کے موسم کے آنے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد رقصاصہ کے
رقص کا بیان ہے۔ یہ بیان بھی ادھورا ہے۔ ایک فنکار کی نظر دوسرے فنکار کے فن پر نہیں
ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی زاہد خشک نصیحت اور وعظ کہنے کو محفل رقص و سرود میں بینجا
ہے۔ نہ تو رقص کے فن پر نگاہ ہے اور نہ رقصاصہ کے جسم کی لچک، لرزش اور چکر کا بیان ہے۔
اس موقع پر رقص کی کوئی تصور یا نظر دوں کے سامنے نہیں ہوتی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی قوت
تخیل اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ وہ چند باتیں ذہن میں رکھ کر اس محفل میں شریک ہوا
ہے اور اپنی باتیں دوٹوک انداز میں کہہ کر جلد از جلد اپنے فرائض سے سبک دوش ہونا چاہتا
ہے۔ اس لئے صرف پانچ بے ربط اشعار کے بعد واعظانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے۔
لیکن ٹھہر تو کون ہے اویم عریاں ناز نہیں
کیا مشرقی عورت ہے تو ہرگز نہیں ہرگز نہیں
اس کے بعد رقصاصہ اور شریف زادیوں کے مابین فرق و امتیاز پیدا کیا گیا ہے۔ ایسا
محسوں ہوتا ہے کہ رقصاصہ کے جلے دل پر نمک چھڑ کا جا رہا ہے۔
چشم فلک نے آج تک دیکھی نہیں ان کی جھلک
سرمایہ شرم و حیا زیور ہے ان کے حسن کا

تجھے میں نہیں شرم و حیا تجھے میں نہیں مہر و وفا
 معلوم نہیں رقاصلہ کو ذلیل و خوار کر کے شاعر کیا کہنا چاہتا ہے آیا، اس کی زندگی کے
 بدنمادغ و دھبیوں کو دکھا کر وہ اس کو اپنے وجود سے نفرت دلانا چاہتا ہے یا صرف اپنے دل
 کی بھڑاس نکال رہا ہے۔ اگر کوئی اصلاح مقصود ہے تو اس صورت میں وجود سے نفرت
 دلانے کے بد لے پشی سے نفرت دلانی چاہیے اور اس معاشرے پر تینکھا اور بھرپور وار کرنا
 چاہیے جس نے رقاصلہ جیسی ہزاروں حسیناوں کو ندامت اور خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور
 کر رکھا ہے۔ اس حصے میں شاعر نے رقاصلہ کو مقبور، مردود، تقدیر کی بھی اور شیطان کی بھی وغیرہ
 خطابات دئے ہیں۔ ان خطابات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں رقاصلہ کے لئے
 بہت زیادہ نفرت بھری ہوئی ہے لیکن شاعر کے دل کا غبار جب نکل جاتا ہے تو دوسرا منظر
 شروع ہوتا ہے، اس میں شاعر رقاصلہ کو بے خطا اور بے قصور بھرتھرا تا ہے۔ مگر غصہ اس کا کم نہیں
 ہوتا ہے۔ غصہ اور نفرت کے ہدف البتہ بدل جاتے ہیں۔ رقاصلہ کے بجائے اس کا ہدف اب
 ملت بیضا ہے۔

مردوں میں غیرت ہی نہیں قومی حمیت ہی نہیں
 وہ ملت بیضا کہ تھی سارے جہاں کی روشنی
 شان حجازی اب کہاں وہ ترک تازی اب کہاں
 اب غزنوی ہمت گئی اب باہری شوکت گئی
 پہلے دوسرے اور تیسرے مناظر کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے
 اشعار میں کسی خطرے کی بمحسوں کر لی ہے۔ اس لئے باتوں کو برابر کرنے بلکہ طعن تشنج کے
 چلائے گئے تیروں کو کند کرنے کے لئے یا کیک واعظانہ انداز ترک کرتا ہے اور مے خواروں
 کی محفل میں جا بیٹھتا ہے۔

جنینے دو جینے دو مجھے پینے دو پینے دو مجھے

جب حشر کا دن آئے گا اس وقت دیکھا جائے گا
ہاں ناچھی جا گائے جا نظرؤں سے دل برمائے جا
پوری نظم سپاٹ اور بے رنگ ہے۔ کہیں منظر کشی دل کو نہیں کھینچتی، کہیں دل کے
بربط پر احساس کا نغمہ نہیں پھوٹتا، کہیں تاثیر کی شدت نظر نہیں آتی کہیں خیالات کی ندرت
دامن دل کو نہیں کھینچتی ہے۔ البتہ اس کی بحر بڑی مترنم ہے اور اپنے اندر نغمگی رکھتی ہے۔ اس
نظم کو گانے پر اچھا اثر پیدا ہو سکتا ہے لیکن پڑھنے میں بے جان معلوم ہوتی ہے۔ حیرت اس
بات پر ہے کہ پروفیسر احتشام حسین وغیرہ نے اس کی تعریف کیوں کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا
ہے کہ حفیظ کی شاعری میں وہ چند ایک نظمیں ایسی تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ان
کے نظریہ فنکاری سے قریب ہے اور اس وجہ سے انہوں نے اس کی تعریف کی ہے۔ حالانکہ
اس نظم میں کلی طور پر نظریہ اشتراک کی حمایت نہیں ملتی۔ رقصہ سماج کا ایک طبقہ ہے اور بڑا
محصور، مظلوم، مقهور اور مردود طبقہ ہے۔ اس لئے اس طبقے کی منظر کشی سماج اور زندگی کو بہتر
بنانے میں معاون ہو سکتی ہے لیکن حفیظ نے دہائیاں اسلام اور ملت بیضا کی دی ہیں اشتراکیت
کی نہیں۔ اس نظم سے متعلق ملک اسماعیل خاں نے لکھا ہے:

”اس نظم میں کوئی خاص بات نہیں، کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ نظم
حفیظ کے رجعت پسند خیالات کی ترجمان ہے۔ اس میں وہ موسیقی اور ترنم
کا آبشار بھی نہیں جس کی وجہ سے حفیظ ہمیشہ مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ اس
نظم کے مطالعہ سے ان کے سماجی شعور پر روشنی پڑتی ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
ان کے نظریات و تصورات کیا ہیں ان کے نظریات میں جامعیت اور تنوع
نہیں، بلندی اور گہرائی ناپید ہے۔“^۱

اس نظم سے متعلق ایک اور بات میرے ذہن سے نہیں نکلتی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ

۱۔ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خاں، جمالستان، دہلی مارچ ۱۹۶۵، صفحہ ۱۰

اس کے پڑھنے کے جرم میں والیائے ریاست خیر پور نے حفیظ کو قید کیا، سزا دی اور ملازمت سے بر طرف کر دیا۔ پوری نظم میں ایک دو اشعار ایسے ہیں جو والیان ریاست سے متعلق ہیں۔

جمعیت	اسلامیہ	شاہنشہ	ہندوستان
اب اس میں دم کچھ بھی نہیں	ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں		
اس نظم کے متعلق فراق گورکھپوری نے ایک تقریر میں کہا:			

”رقصہ نامی نظم میں وہ پہلے رقصہ کی اداوں سے لچاتے ہیں پھر خود پر اور رقصہ پر لعنتیں سمجھتے ہیں اور نہ جانے کیا سوچ کر یہ لکھ دیا ہے کہ اسلامی حکومت کے عبدالزئیں میں یا تو رقصہ نہیں تھی یا رقصہ کی بے با کیا جنہیں وہ غیر شرعی بھی بتاتے ہیں۔ رقصہ عورتوں میں نہیں تھی۔ تاریخ الف لیلہ، روایتیں اور واقعات سب حفیظ کے اس بیان کے خلاف ہیں“۔^۱

ورنہ پوری نظم میں طنز کا نشانہ ملت بیضا ہے اور اس رشتے سے ہر فرد و بشر میرے ذیال میں نظم رقصہ کو جو شہرت ملی اس کے اسباب حفیظ کا قید ہونا، سزا پانا اور ریاست خیر پور کی ملازمت سے بر طرف ہونا ہیں ورنہ یہ نظم فتنی اعتبار سے بہت خوبصورت نہیں۔ آغاز، وسط اور انجام کے مابین رشتہ بھی بہت ڈھیلا ہے۔ اس نظم کا انجام آغاز اور وسط سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس طرح یہ نظم بالکل ہی غیر متوقع طور پر انجام تک پہنچتی ہے۔

ایک دوسری نظم ابھی تو میں جوان ہوں ہے۔ یہ نظم چار بندوں پر مشتمل ہے۔ ہر بند میں دس اشعار ہیں۔ پہلا بند جوانی کی مست خرامیوں کے لئے پس منظر کا کام دیتا ہے۔ خوشگوار ہوا میں چل رہی ہیں، پھول مہک رہے ہیں، بہار چھائی ہے اور کالی کالی بد لیاں انھ رہی ہیں۔ یہ مناظر مئے کشوں کو مئے کدھ کی طرف بلاستے ہیں۔ شاعر ساقی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اس موسم اور مناظر میں تو کہاں جا رہا ہے۔ مئے کدھ کی طرف چلو پیالہ بھر بھر

کر دو۔ زاہد کا خیال دل سے نکالو اور مئے کشون کی تشنگی دور کرو
 سبو اٹھا پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے ادھر
 چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر
 وہ کالی کالی بد لیاں
 افق پہ ہو گئیں عیاں
 وہ اک ہجوم مئے کشاں
 ہے سوئے میکدہ روائ

دوسرے بند میں عاشق جوان سال کی مجبوریوں کا ذکر و بیان ہے۔ عبادت اور
 ثواب کے خیالات اپنی جگہ درست ہیں مگر موسم اور فضا عاشقانہ ہیں۔ حسیناً میں اپنے حسن کا
 جلوہ دکھار ہی ہیں۔ ان کے ناز و انداز فتنہ ڈھاتے ہیں۔ ہواوں میں عطر بیزی ہے۔ نگاہوں
 کے تیر برس رہے ہیں۔ ایسے ما حول اور فضا میں کسی جوان کا داد تحسین دینا عین فطری ہے،
 اس لئے زاہد خشک کو اپنے درمیان سے ہٹانے کی یہ توجیہہ پیش کی ہے۔

چلو جی قصہ مختصر تمہارا نقطہ نظر
 درست ہے تو ہو مگر ابھی تو میں جوان ہوں
 تیرے اور چوتھے بند میں جوانی کی متانہ و شی کی تصویر کشی ہے۔ ندی، نالے،
 بلبل، معشوق سب جوانی کی بدمستیوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ جوانی کو اس طرح گزارنے کا
 عہد ہے۔

نہ غم کشود و بست کا بلند کا نہ پست کا
 نہ وعدہ است کا نہ بود کا نہ ہست کا
 امید اور یاس گم حواس گم قیاس گم
 نظر کے آس پاس گم ہمہ بجز گلاں گم

نظم ابھی تو میں جوان ہوں، ایک بے فکر نوجوان کی ذہنی عیاشی کے چند بے ربط خطوط کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نوجوان کو مذہب، زہد و تقویٰ اور ثواب و عبادت کا خیال بھی ستاتا ہے مگر جوان امگلوں کے مقابلہ میں اس کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ابھی تو میں جوان ہوں، کا جوان خود حفیظ ہیں۔ زندگی کو جن رنگوں میں بکھرے اور محلتے دیکھا ہے وہ تمام رنگ اس نظم میں منعکس ہوئے ہیں۔

بہر حال یہ نظم رقصہ کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت ہے۔ فکر کے گہرے ہائے آبدار تو نہیں رو لے جاتے مگر ایک نوجوان کی ذہنی کشمکش کی پچھی تصویر یہ ملتی ہے۔ اس نظم کے تمام بند ایک دوسرے سے ہم مسلک ہیں۔ اس طرح یہ اپنے انعام تک آہستہ آہستہ خوب صورتی سے پہنچتی ہے۔

نہ مئے میں کچھ کمی رہے قدح سے ہمی رہے
 نشت یہ جمی رہے بھی ہمہ ہمی رہے
 وہ راگ چھیڑ مطربا
 طرز فزا الہ ربا
 اثر صدائے ساز کا
 جگر میں آگ دے لگا
 ہر ایک لب پہ ہو صدا نہ ہاتھ روک ساقیا
 پلائے جا پلائے جا
 ابھی تو میں جوان ہوں

اس نظم میں ترجم اور نغمگی کا ایک دریا موجود مارتا ہے۔ شیرینیت اور موسیقیت بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس کی تکنیک میں گیت کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ نظم اردو نظم نگاری میں حفیظ کی دوسری نظموں کے ساتھ ہیئت کے اعتبار سے جدت طرازی کا نمونہ ہے۔

جلوہ سحر، فرحت کی تلاش، چاند کی سیر، برسات، کرشن کنھیا، طوفانی کشتی، بستی
ترانہ، تاروں بھری رات، شہسوار، کربلا، سپنا، اندھی جوانی، نندوں کی بستی، موت کا قافلہ،
ہلال عید، میرا سلام لے جا، تصویر کشمیر، اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے، نیرنگ فرنگ،
درشن درشن وغیرہ حفیظ کی ایسی نظمیں ہیں جو اپنی نغمگی، ترجم ریزی اور شیرینیت سے ہمارے
دل و دماغ کو موہ لیتی ہیں۔ ان میں بعض نظمیں رومانی ہیں، بعض فکری اور بعض منظری۔
رومانی نظموں میں عشق کی دلفر پیاس ہیں، فکری نظموں میں فکر کے ہلکے ہلکے خطوط اور منظری
نظموں میں فطرت کی فیاضیوں کی خوبصورت منظر کشی۔

جہاں تک حفیظ کی رومانی نظموں کا تعلق ہے ان میں سے ایک نظم ابھی تو میں
جو ان ہوں، کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ عشق کی نیرنگیوں کو پیش کرنے
کے لئے حفیظ نے بہت سیدھے سادے اور آسان الفاظ کی مدد لی ہے۔ کوئی بہت گھری اور
ادبی بات کہنے کے لئے فلکر کو دور کی کوڑی لانے پر معمور نہیں کیا ہے بلکہ آس پاس جو کچھ فضا
اور ماحول میں ملا ہے ان کو نظم کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس لئے ان نظموں میں اقبال
کی گھرائی اور اختر شیرانی کی محبت کی سرشاری نہیں ملتی۔ اختر شیرانی کی نظمیں دراصل ان کی
زندگی کی آئندہ دار ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی شراب و شاہد بازی میں گزاری۔ اس لئے ان کی
نظموں کی تاثیر دو چند ہو گئی ہے۔ جبکہ حفیظ شروع سے مذہبی ذہن رکھتے تھے اور اندر ہیرے
اجالے میں ان کا قدم بہکنے سے قبل درشرع اور وعظ و ناصح کو یاد کر لیتا تھا۔ اس لئے شباب
و شراب سے متعلق ان کی نظمیں اپنے اندر وہ تاثیر اور شدت خلوص نہیں رکھتیں جو اختر شیرانی
کی نظموں میں ملتی ہیں۔ حفیظ جالندھری کی رومانی نظموں سے متعلق ملک اسماعیل حسن خاں
نے بڑی سچی بات کہی ہے:

”یہ انسان کو بالکل محو اور مگن نہیں بناتیں اس دنیا میں پہنچ کر

انسان کا ہش حیات کو بالکل نہیں بھولتا۔ احساس زیاد اس کے دل سے

فراموش نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ ان جیسی نظموں میں خلوص نہیں۔ اضافت کی انتہا نہیں۔ تاثیر کی دولت نہیں جو اختر شیرانی کے یہاں اپنی بھرپور اور انتہائی حسین شکل میں ملتی ہے جس سے بہتر کا شاید ہی تصور کیا جاسکے۔ یہ نظمیں ایک رومانی شاعر کے تجربات سے آگئیں بڑھتیں۔ کہیں کہیں کوئی نگینہ ان میں بھی جگہاں تھا ہے۔ لیکن ایسے مقامات بہت کم آتے ہیں۔ اس قسم وقبیل کی تمام نظموں میں سطحیت، بلکا پن اور ذہنی بچپن ہے۔ نفس مضمون میں کوئی جدت، کوئی نیا پن، خلوص کی روح نہیں، زندگی کا عرفان نہیں یہ بلکی پھلکی رومانیت اور جوانی کی سستی جذباتیت کی مثالیں ہیں اور بس...“۔ لیکن منظری نظمیں اپنے اندر حسن و دلکشی رکھتی ہیں۔ ان میں منظر کی گوناگوں کیفیتوں کو سمیٹا گیا ہے۔ فطرت کی بولگمنیاں ان میں بکھری پڑی ہیں۔ ان کی ترجم ریزی اور موسیقیت نے ان کو اچھوتا بنا دیا ہے۔ ان میں فن کی پختگی بھی ہے۔ نظم جلوہ سحر ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں چودہ بند ہیں۔ ہر بند ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ آغاز تا انجام نظم میں سحر کی جلوہ نمائی کا ذکر و بیان ہے۔ ابتداء اس طرح ہوتی ہے۔

تمام ملک ہست پر بلند اور پست پر
قلم اور حیات پر
تمام کائنات پر
خمو شیوں کا ہے چلن سکوت حکمران ہے
فسون مرگ سکھ زن حیات بے نشان ہے
وہ جوش زندگی نہیں
ہنسی نہیں خوشی نہیں

وجود بے وجود ہے جمود ہی جمود ہے
 تمام ملک ہست پر بلند اور پست پر
 خموشی اور سکوت کا یہ دائرہ سارے جہاں کے گرد پھیلا ہوا ہے۔ ابھی سحر نمودار نہیں
 ہوئی ہے۔ اس کے قبل آسمان اور زمین میں بس خموشی، سکوت اور جمود ہی جمود ہے۔ خموشی،
 سکوت اور جمود کی تصوری مندرجہ ذیل اشعار میں زیادہ نکھر کر سامنے آئی ہے۔
 مسافران شب مگر تھکن سے چور ہو گئے
 نہ ختم ہو سکا سفر تو چلتے چلتے سو گئے
 یہ انجمن کی انجمن
 ہے خامشی میں غوطہ زن
 اس کے بعد منظر بدلتا ہے۔ خموشی، سکوت اور جمود ٹوٹتا ہے اور اس کی جگہ نور اور
 حرکت نظر آتی ہے۔

یکا یک ایک نور کا غبار مشرق سے اٹھا
 جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا
 اور آسمان پہ چھا گیا
 حسینہ نمود نے یہ نقاب اٹھا دیا
 فسون گہ شہود نے طسم شب مٹا دیا
 یکا یک ایک تازگی
 یکا یک ایک روشنی
 نگاہ جاں میں آگئی حیات میں سما گئی
 یکا یک ایک نور کا غبار مشرق سے اٹھا
 اب صبح کی آمد آمد ہے۔ زمین نور میں نہا گئی اور فلک پر شفق نمودار ہوئی، ستارے

اور چاند نیند میں ڈوب گئے، عبادت گاہوں کے دروازے کھل گئے، دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھے اور قبولیت کا دروازا ہوا اور اذان کی آواز گونج اٹھی۔ نمازی جاگ گئے، نمازی نماز کے لئے دوڑ پڑے۔ دوسری طرف مندر کا دروازہ کھلا۔ سنکھ بختے لگا۔ پچاری پوجا پاٹھ میں لگ گئے۔ ان کاموں سے فراغت ہوئی تو دوسرا منظر پیش نظر ہے۔ کسان مویشیوں کو لے کر اپنے مزارع کی طرف جاتے ہیں۔ مزے میں آکے کوئی تان فضا میں بکھیر دیتے ہیں۔ اب مشرقی خاور نے روشنی کی پہلی کرن پھیلائی۔

وہ برق سی چمک اٹھی سحاب کے غبار میں
وہ آگ سی بھڑک اٹھی افق کے لالہ زار میں
وہ ذرہ ذرہ خاک کا
نظر فروز ہو گیا

اس طرح الگ الگ بندوں میں حسینہ سحر، نیم سحر پرند نغمہ ریز، گنگ، حسینہ دلوواز اور مطربان خوش آواز کے جاگتے اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہونے کی خوبصورت اور دلکش تصویریں ملتی ہیں۔ اس طرح جلوہ سحر نمودار ہوا اور ساری کائنات میں نور و نغمہ، حرکت و حرارت کی فضا قائم ہو گئی۔ یہ نظم اپنی بیت اپنے رنگ و آہنگ کی وجہ سے عظمت اللہ خال کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن عظمت اللہ خال کی منظری نظموں کے مقابلے میں اس میں غنائیت، شیرینیت اور موسیقیت زیادہ ہے۔

حفیظ کی نظمیں چاند کی سیر، برسات، بستی ترانہ، تاروں بھری رات، راوی میں کشتی، شام رنگیں، ہمالہ وغیرہ خاص منظر نگاری سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس دور کی نظموں میں بمحل اور بے محل عشق و رومان کی سرمیاں بھی ملتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح جلوہ سحر میں آخر کے بندوں میں حسینہ دلوواز کے نیند سے بیدار ہونے اور گنگا کے کنارے خوش اداوں کے نہانے کا ذکر و بیان ہے۔

حفیظ کی فکری نظموں میں فرصت کی تلاش، نیرنگ فرنگ، اپنے وطن میں سب کچھ
ہے پیارے، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فرصت کی تلاش دراصل شاعر کی بے پناہ مصروفیتوں کا
ردعمل ہے۔ لیکن یہ ردعمل ہر اس شخص کا ہے جو جہد حیات میں تگ و تاز کر رہا ہے۔ نظم
فرصت کی تلاش میں بعض بہت نادر اور نازک تشبیہیں بھی ملتی ہیں۔ ان تشبیہوں نے فرصت
کی تلاش جو ایک غیر مرئی تصور ہے اس کو مرئی بنادیا ہے۔

یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں

جس طرح کوئی پتا

بہتا ہوا دریا میں

ساحل کے قریب آکر

چاہے کہ ٹھہر جاؤں

اور سیر ذرا کروں اس عکس شجر کا

جو دامنِ دریا پر زیباش دریا ہے

یا باد کا وہ جھونکا

جو وقف روائی ہے

اک باغ کے گوشے میں

چاہے کہ یہاں دم لوں

دامن کو ذرا بھر لوں

اس پھول کی خوبیوں سے جس کو ابھی کھلنا ہے

فرصت کی تمنا میں یوں وقت گزرتا ہے

بنتے ہوئے پتے اور بہتی ہوئی ہوا کا ایک لمحہ فرصت تلاش کرنا بڑا نازک خیال

ہے۔ جس طرح پتا مونج آب پر اتنی دیر رکنے کی طاقت نہیں رکھتا کہ پیڑ کا عکس ہی ملاحظہ

کر سکے اور ہوا کو اتنی دری تھمنے کی اجازت نہیں کہ کھلتی کلیوں کی خوبی سے لطف انداز ہوئے۔ اسی طرح انسان کی زندگی ہدم روای دواں اور متحرک ہے۔ اس خیال کو حفیظ نے اپنی نظم فرصت کی تلاش میں پیش کیا ہے۔ انسان کی زندگی میں حرکت و عمل سے متعلق خیالات اقبال نے اپنی شاعری میں فکر و فلسفہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حفیظ کے یہاں نہ تو فکر کی وہ باری کی ہے اور نہ فلسفہ کی گہرائی، مگر نظم بہت متاثر کرتی ہے۔ اس میں جو تشبیہیں پیش کی گئی ہیں وہ بڑی اچھوتوی ہیں۔ تشبیہیں ایسی ہیں جو حفیظ کو بلند مرتبہ شاعروں کی صاف میں لاکھڑا کرتی ہیں۔ فرصت کی تلاش حفیظ کے مجموعہ کلام نغمہ زار کی نظم ہے اور اس مجموعہ کلام کے متعلق خود حفیظ کا بیان ہے کہ ان میں جوانی کے دن اور جوانی کی راتوں کا قصہ ہے اور بس۔ وہ رقم طراز ہیں:

”نغمہ زار کا دور اڑ کپن سے غنومن شاب تک کا زمانہ ایک سلسلہ
 ان واقعات کا تھا جن کی ہر بات انوکھی، سہانی، خوشگوار تھی۔ خوشی حاصل
 ہو جانے پر خوشی، رنج و غم سے دوچار ہونے پر رنج و غم مسکراہٹ، آنسو بھی
 طلب و تلاش، یعنی استغنا انانیت، غم عشق کی جستجو، فکر روزگار سے گریز،
 زندگی کی اخلاقی ذمہ داریاں بھانے کے لئے
 دیکھا نہ کاروبار محبت کبھی حفیظ
 فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے
 بے فکری، خود نظری، لطافت، نزاکت، رقص آنچل، باغ و بہار،
 کہسار، مخندی ہوا میں، کالی گھٹا میں بجلیاں، زلفیں، رخسار، تمباکیں دید،
 سب ذاتی انفرادی خود فریباں ابھی تو میں جوان ہوں کا جلوس... اپنے عمل
 پر اور ماحول کے روایتی پن کے سبب سے بے عمل بھی، کچھ مفید، کچھ غیر
 مفید۔ مبہم مبہم، واضح واضح، شعور و امتیاز اور لاشعوری کا درمیان برزخ۔“

نغمہ زار اور سوز و ساز میں فرصت کی تلاش، ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح، رقصہ وغیرہ فکر کے چند خطوط ابھارتے ہیں۔ یہ صرف جوانی کے دن اور جوانی کی راتوں پر مشتمل نہیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان نظموں میں حفیظ کی فکر اپنی مستقل حیثیت کی تلاش کر رہی ہے۔ تراش خراش اور نکھر کر شاعری کے قالب میں ڈھلنے کو وہ بے تاب ہے۔ چنانچہ ان کی وہ نظمیں اس قبیل کی شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں جو تلخابہ شیریں میں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کی شاعری کے متعلق خود حفیظ کا بیان ہے:

”تلخابہ شیریں کیفیات میں ان دونوں سے الگ ہے۔ اس میں افرادی اور نظری انسانیت کا نشہ اتر چکا ہے۔ ایک نرالی دھن، تازہ منصوبہ بندی، نی منزل درپیش ہے۔ وہ بیج اگے ہیں اور بار آور ہو رہے ہیں جو ماہول نے بوئے تجربے نے جن کو ہوا اور نہدا بہم پہنچائے۔“^۱

نیرنگ فرنگ، اسی قسم کی شاعری کا ایک نمونہ ہے جس کی طرف اشارے مندرجہ بالا سطروں میں حفیظ نے کئے ہیں۔ یہ نظم ۱۹۳۸ء میں لندن کے ایک جلسے میں سنائی گئی ہے۔ اس جلسے میں انگریز سامعین بھی تھے بلکہ ایک سامع ایسا بھی تھا جس نے حفیظ کی نظم اپنے دلیش میں سب کچھ ہے پیارے سن کر کہا تھا کہ شاعر home sickness کا شکار ہے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے رہا ہے۔ اس انگریز سامع نے نظم نیرنگ فرنگ کو سن کر کہا تھا کہ انگلستان کو ایک ہندوستانی ان کے گھر میں آ کر آئیں دکھا گیا۔

اس نظم میں مغرب کی ترقی کی تصویریں تو ہیں ہی ساتھ ہی اس کی اخلاقی اور تہذیبی پست حالی کا ذکر بھی۔ ان دونوں جب یہ نظم کبھی گئی مغرب کے تہذیب و تمدن سے متعلق ہندوستانیوں میں دو طرح کے احساسات تھے بعض اس کی چمک دمک کے متواں تھے اور پرشوق نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بعض اس میں روحانی اور اخلاقی عناصر کی کمی پاتے

¹ دیباچہ تلخابہ شیریں

تھے۔ اس وجہ سے ہندوستانیوں کو اس کے دستبرد سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ نظم نیرنگ فرنگ، دراصل نظم اپنے دلش میں سب کچھ ہے پیارے کی تکمیل کرتی ہے۔ دونوں نظموں کے موضوعات ایک جیسے ہیں۔ دوسری نظم جہاں مغربی تہذیب کی چمک دمک کو ظاہر کرتی ہے اور ہندوستانی نوجوانوں کو مغربی تہذیب کی بحر سے باہر لَا کر اپنے وطن باتی ہے وہاں پہلی نظم تہذیب مغرب کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتی ہے۔ نظم اپنے دلش میں سب کچھ ہے پیارے، کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رشک عون ہے باغ وطن بھی
گل بھی ہیں موجود گل پیر بن بھی
نازک بدن بھی غنچہ دہن بھی
لیٹئی روشن بھی شیریں تختن بھی
کچھ کم نہیں وہ
اجڑا چمن بھی
اس کے بھی اک بار کر لے نظارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

انگلستان کا یہ نظارہ نامکمل ہے۔ حفیظ فوراً وارد ہوئے تھے، انہوں نے اپنے ایک دوست کو وطن لوٹنے کے لئے کہا اور اس نے جب یہ نکلا سا جواب دیا کہ وہاں کیا رکھا ہے تو ان کی رگ حمیت بھڑک اٹھی جو ایک نظم کی صورت میں ڈھل گئی۔ لیکن جب دو چار مہینوں میں انگلستان کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس سے متعلق خیالات پختہ ہوئے تو نظم ”نیرنگ فرنگ“ وجود میں آئی۔ نیرنگ فرنگ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ بآسانی یہ اندازہ ہوگا کہ یہ نظم اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے کی تکمیل کس طرح کرتی ہے۔

رنگینِ گل بار شر دیکھ رہا ہوں حسن عمل و حسن نظر دیکھ رہا ہوں
 ہر سمت فراوانی زر دیکھ رہا ہوں سرمایہ و محنت کا اثر دیکھ رہا ہوں
 مشرق بھی نہیں علم و کمالات سے خالی مشرق ہی کے در پر کبھی مغرب تھا سوالی
 ہاں ایک ادا دیکھی ہے مغرب میں نزالی مجبور ہے مشرق کی جہاں ہمت عالی
 یہ ایک ادا ناز ہے عورت کی بقا پر
 مشرق میرا قرباں ہے اسی ایک ادا پر
 نظم نیرنگ فرنگ اسی طرح مغربی تہذیب و تمدن کی خوبی اور خامیوں کو ظاہر کرتی
 ہے۔ فتنی اعتبار سے یہ نظم حفیظ کی شاہکار نظم تو نہیں کہی جاسکتی مگر فکر کے غنچے اس میں چلتے
 ہیں۔ اکبر نے تہذیب فرنگ کی براپیوں کی طرف ہنسی مذاق کے انداز میں اشارے کئے تھے
 جب کہ اس نظم میں تصویریں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں میں مشرق کا ذہن و
 دماغ کا رفرما ہے۔ مغرب کی خوبیاں اور خامیاں سب اس کو چکا چوند کر رہی ہیں۔ وہ ایک
 عالم حیرت میں ہے مگر مشرق کی عظمت اس کو ان باتوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لئے آخر
 کار وہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا سہارا لیتا ہے۔ اس طور پر مغرب کو کھوکھلا اور مشرق کے ماضی
 میں عظیم ہونے کی یاد دہانی بھی کرتا ہے۔ اس طرح شاعر دراصل اس نظم میں ایک مشرقی
 ذہن سے مغرب کی سیر کرتا ہے۔

اپنے دلیش میں سب کچھ ہے پیارے اور نیرنگ فرنگ۔ میں جس طرح حفیظ
 جالندھری کی فکر پختہ تر ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اسی طرح تلخابہ شیریں کی دوسری نظموں
 میں بھی۔ میرے خیال میں فکر کے یہ خطوط ان کی سوز و ساز کی نظم ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح سے
 جاتے ہیں۔ یہ نظم دراصل مجاہد ملت مولانا محمد علی کی وفات پر کہی گئی ہے۔

لغہ زار، سوز و ساز، تلخابہ شیریں کے علاوہ نظموں کا ایک اور مجموعہ ہندوستان ہمارا
 حفیظ جالندھری کی یادگار ہے۔ یہ نظمیں سادہ اور صاف زبان میں ہندوستان کی تاریخ ہے

جس میں رامائش کی کتھا سے لے کر راجا رنجیت سنگھ تک ہندوستان کے متعدد اور مختلف بادشاہوں، رئیسوں راج و اڑوں اور امراء کا ذکر و بیان ہے۔ ان لوگوں کے ذکر و بیان کے پس منظر میں ہندوستان کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان بہت سادہ، سہل اور روایا ہے۔ یہ تمام کی تمام نظمیں بچوں کے لئے کہی گئی ہیں۔ ان کی شان نزول یہ ہے کہ مدراس کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے طلباء کے لئے بطور ورنہ کولر کہی گئی ہیں۔ یہ نظمیں بے شبہ عظمت اللہ خاں اور اسماعیل میرٹھی کی یاد دلاتی ہیں۔ ان حضرات نے بھی بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ موجودہ دور میں ہم نے بچوں کی کتابوں سے آنکھیں موند لی ہیں۔ بچوں کی نفیات کو سامنے رکھ کر نظمیں کہنا آسان کام نہیں ہے لیکن حفیظ جالندھری نے اس میدان میں بھی اپنی شہسواری کا سکھ بھایا ہے۔ اس کتاب کی آخری نظم بھارت کے نونہالو، کا ایک بند پیش ہے۔

عیسائی، پارسی سکھ ہندو ہو یا مسلمان نیکی ہے دھرم سب کا نیکی ہے سب کا ایماں سب سے کرو بھلائی مذہب کا ہے یہ فرمان حاصل ہیں آج تم کو ہر اک طرح کے سامان

یہ فائدے انھالو

بھارت کے نونہالو

ہندوستان والو

کتاب، ہندوستان ہمارا، دوسو چالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب میں نظم نگاری کی یہی شان ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے سرمایہ، الفاظ، نفیات اور سیکھنے کی طاقت و صلاحیت پر حفیظ کی گہری نظر ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو سکھانے اور بتانے کے لئے ان کے پاس خاص موضوعات ہیں۔ تاریخ، اخلاق اور تہذیب کی وہی باتیں بچوں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جو ثابت ہیں اور جن میں زندگی کو بہتر بنانے کے عناصر ہیں۔ اس کتاب کے دیباچے میں عبد اللہ یوسف علی نے لکھا ہے:

”مصنف نے ایسی تمام باتوں کو نظر انداز کر دینے کی کوشش کی ہے جن کا مادر وطن کے کسی فرقے یا جماعت کو ناگوار گزرنے کا اختیال تھا۔ اردو زبان میں یہ پہلی کوشش ہے کہ تاریخ ہند کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے میں ان تمام حضرات سے جو تعلیمی امور میں دلچسپی لیتے ہیں اس کتاب پر توجہ کرنے کی سفارش کرتا ہوں۔“

مندرجہ بالا سطور میں حفیظ جالندھری کی نظم نگاری کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کی نظمیں فکر کی گیرائی اور گہرائی کے لحاظ سے قابلِ اعتنا نہیں ہیں۔ البتہ ان میں ترجم اور موسیقیت کا آبشار ضرور نظر آتا ہے۔ بیانیہ شاعری کی خصوصیات ان میں ملتی ہیں مگر ان کی نظمیں جوش، اقبال، سیماں اور جمیل مظہری کی نظموں سے میل نہیں کھاتیں۔ البتہ انہوں نے نظم نگاری کی بیانت میں جو تجربے کئے ہیں وہ ایسے ہیں جو اردو میں ان کو زندہ رکھیں گے۔ ساتھ ہی ان کی وہ نظمیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں توجہ خاص کی مستحق ہیں۔ ساتھ ہی حفیظ کی منظری نظمیں اردو میں خاص ندرت رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں مناظر فطرت کی بڑی خوش اسلوبی سے عکاسی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اردو میں یہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان نظموں کے بارے میں فراق گورکھپوری کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

”حفیظ کی منظر نگاری خاص توجہ کی مستحق ہے۔ موسیقی اور مصوری سنگیت اور چتر کاری کا جو میل حفیظ کی منظر یہ نظموں میں ہمیں ملتا ہے وہ کم سے کم مجھے تو اور کہیں نہ ملا یہ لے اور یہ جھلکیاں، مناظر کے اساس میں یہ ابھار یہ کرک اور مقامی رنگ خاص چیزیں ہیں۔“

بہر حال، باوجود اس کے کہ حفیظ کی شاعری اور فنکاری سے متعلق اردو کے ناقدین

مخالف اور متصاد آرار کھتے ہیں حفیظ کو ان کی منظریہ نظموں میں ملنے والی موسیقیت، شیرینیت اور بچوں کی خوبصورت نظموں کی وجہ سے ایک کامیاب اور قابل قدر نظم نگار تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ باعثِ اردو میں دلکشی اور جاذبیت اس میں ملنے والے رنگ برلنگے بچوں سے ہے۔ نظم نگاری کی دنیا میں حفیظ کا اپنا مخصوص رنگ ہے اور مختلف شاعر اور مقبولیت ملی ہے وہ آسانی پہچان لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو بحیثیت شاعر جو شہرت اور مقبولیت ملی ہے وہ بہت کم ملی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی نظموں میں زندگی کی رنگارنگ تصویریں ملتی ہیں جن سے ہر ملک اور ہر مزاج کے لوگ اپنے اپنے ذوق کی سیرابی کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

* * *

مثنوی نگاری

اردو میں متعدد مثنویاں مذہبی، علمی، تہذیبی، منظری اور جنگی نوعیت کی تصنیف ہیں مگر کسی کو بالا متنشائے موجز راسلام وہ شہرت نہ ملی جو چند عشقیہ مثنویوں کو ملی۔ ہماری حیرت میں اس وقت اور اضافہ ہوتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں مثنوی کافن براہ راست فارسی سے مستعار ہے۔ فارسی مثنویوں میں شاہنامہ فردوسی کو جو مقبولیت اور شہرت ملی کسی دوسری مثنوی کو نہیں ملی۔ خمسہ نظامی اور مثنوی سعدی کو بھی نہیں۔ فارسی کے برعکس اردو میں عشقیہ مثنویاں کیوں مقبول ہوئیں اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اردو شاعری آغاز سے ہی عشقیہ جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ اس لئے ولی سے لے کر اس وقت تک غزل اردو کی آبرو سمجھی گئی ہے۔ چنانچہ اردو کے عظیم المرتبہ شاعروں نے زیادہ تر عشقیہ جذبات کی ترجمانی میں اپنا ذہن لگایا۔ دوسرے موضوعات کی طرف توجہ کم دی۔ اردو میں بلند پایہ عشقیہ مثنویوں کا پایا جانا اور دوسرے موضوعات سے متعلق اس پائے کی مثنویوں کا نہ پایا جانا اسی امر پر دال ہیں۔ حفیظ جالندھری کی مثنوی شاہنامہ اسلام اسی پس منظر میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی کا نام ہمارے ذہن کو فردوسی کے شاہنامہ کی طرف منعطف کرتا ہے۔ یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ فردوسی کے شاہنامہ کے جواب میں تصنیف ہوئی ہے کیونکہ شاہنامہ میں قدیم ایرانی تہذیب کو اسلامی تہذیب پر فوقيت دی گئی ہے۔

ز شیر شتر خور دند و سوار عرب راجائے رسید ست کار

کہ تخت کیاں را کنند آرزوں تو بروائے چخ گردان تفو
 مگر سب تصنیف کے عنوان سے حفیظ نے جوا شعار قلمبند کئے ہیں ان میں فردوسی
 کے مقابلہ میں اپنے کو کمتر اور عاجز قرار دیا ہے ملاحظہ ہو۔
 کیا فردوسی مرحوم نے ایران کو زندہ
 خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ
 عجم کا شاہنامہ بس وہ فردوسی کا حصہ تھا
 تخيیل ہی کا ہنگامہ تھا یعنی ایک قصہ تھا
 مگر اس کی زبان اس کا بیان اعجاز ہے گویا
 کہاں کی رسمی وہ خود ہی تیرانداز ہے گویا
 زبان پہلوی کی ہم زبانی ہو نہیں سکتی
 ابھی اردو میں پیدا وہ روانی ہو نہیں سکتی
 نحیف و ناتواں بے علم و بے مقدور ہستی ہوں
 غم و اندوہ جس میں بس رہے ہیں میں وہ بستی ہوں
 کہاں ہے اب وہ دور غزنوی کی فارغ البابی
 غلامی نے دبا رکھی ہے میری ہمت عالی

یہ درست ہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں حفیظ نے خود کو فردوسی کے مقابلے میں
 ہمچنان قرار دیا ہے مگر ان اشعار میں معنی کی دوسری سطح بھی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ
 حالات اگر سازگار ہوں تو حفیظ فردوسی کے مقابلے میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ فردوسی کی زبان
 اور بیان کو اعجاز کا درجہ اس لئے حاصل ہے کہ اس کو پہلوی زبان کی دولت اور غزنوی عہد کی
 فارغ البابی نصیب ہے۔ اس کے برعکس حفیظ کو کمتر درجہ کی زبان اور دور غلامی ملا ہے۔ ان
 اشعار کو ان کے ماقبل اور مابعد کے اشعار سے ملا کر پڑھیں تو میرا موقف اور واضح ہو گا۔

ماقبل کے اشعار ہیں۔

مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو
سکوت مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو

عزیمت ہے نہ جرأت ہے نہ ہے تاب و تواں باقی
فقط حضرت سے تکنے کے لئے ہے آہاں باقی

نظر آتے ہیں اب وہ صفت سکن بازو نہ شمشیریں
مقدار کی طرح سونی پڑی ہیں آج تکبیریں

گئی دنیا سے آقا نی محمد کے غلاموں کی
بھلا بیٹھے جو یاد اپنے سلف کے کارناموں کی

ارادہ ہے کہ پھر ان کا لہو اک بار گرماؤں
دل سنگیں خن کے آتشیں تیروں سے برماوں

مابعد کے اشعار ہیں۔

مگر سینے میں دل رکھتا ہوں جس میں جوش غیرت ہے
سراسر راکھ ہے لیکن ابھی تک پر حرارت ہے

کیا ہے روح کو زندہ مدینے کی ہواؤں نے
جنگایا خواب سے احساس کی غیبی نداوں نے

نوید صح بخشی ہے سکوت شام نے مجھ کو
مخاطب کر لیا ہے قوت الہام نے مجھ کو

بظاہر میں جو تصویرِ خن میں رنگ بھرتا ہوں
کسی آواز کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں

ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اسلام کی زبوں حالی سے
بہت اثر قبول کیا ہے اور اسلام کا شاہنامہ لکھ کر اہل اسلام کو ان کی شاندار تاریخ کی طرف
متوجہ کیا ہے کہ اس روشنی میں وہ اپنے اعمال و افکار کو نئے سرے سے ترتیب دیں اور قدر
مذلت سے نکل کر عزت و احترام کی سر بلند چوٹیوں کو اپنے قدموں سے روندھالیں۔ اس لئے
آگے کے اشعار میں ایسی تصنیف کا مقصد واضح لفظوں میں پیش کر دیا ہے۔

قلم سے زندہ کر سکتا ہے تو ان کارنا موں کو
سنا سکتا ہے پھر پیغام آزادی غلاموں کو

نہ شاہوں سے توقع رکھ نہ دنیا کے امیروں سے
عظیم الشان ہے یہ کام نکلے گا فقیروں سے

عوامِ الناس میں ہنگامہ احساس پیدا کر
دلوں کو از سر نو حسن حریت پہ شیدا کر

اٹھے نامِ خدا جب بت شکن بن کر قدم تیرا
ہزاروں غزنوی پیدا کرے زور قلم تیرا

مسلمانوں کے دل میں شعلہ غیرت کو بھڑکا دے
مہیبِ رعد بن کر کفر کی غیرت کو دھڑکا دے

غلاموں کو پیغام آزادی سنانے کا جب آغاز کیا تو بہت سے ناقد حضرات نے اس
امر کی طرف اشارہ کیا کہ اس میں شعری جذبہ سے زیادہ ملی جذبہ کی کارفرمائی ہے۔ فراق

گورکھپوری نے اپنی ایک ریڈ یو تقریر میں فرمایا:

”جہاں تک شاہنامہ اسلام کا تعلق ہے مجھے اور شاید بہتلوں کو حفیظ کی شاعری کے اس خاص رنگ اور خاص انداز سے شاہنامہ اسلام بالکل بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسے بے اختیار سراہنے پر تلا ہوا ہو تو وہ اسے جھوم کر پڑھ سکتا ہے اور حفیظ کی دوسری شاعری کے مقابلے میں شاہنامہ اسلام کسی کو پسند نہ آئے تو وہ یہ سمجھ لے کہ ملن نے فردوس گم شدہ لکھنے کے بعد کتنی ایسی چیزیں لکھی ہیں جن میں شعریت سے زیادہ نثریت ہے۔ ایک فطری شاعر کی زندگی میں کبھی کبھی نثریت کا دور بھی آ جاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاہنامہ اسلام لکھنے میں شاعرانہ جذبے کی جگہ ملی جذبے نے لے لی ہو۔“

فرقہ گورکھپوری کے ہر نکتہ کا جواب حفیظ نے شاہنامہ اسلام کی چوتھی جلد کے دیباچہ میں دیا۔ فرقہ گورکھپوری نے جو تبصرہ اپنی ریڈ یائی تقریر میں کیا تھا اس وقت تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ ان جلدوں کا دیباچہ شیخ عبدال قادر صاحب نے لکھا ہے حفیظ نے نہیں۔ مگر چوتھی جلد میں فرقہ کے ذریعہ اٹھائے گئے نکات کا جواب دینے کے لئے حفیظ نے یہ کام خود سرانجام دیا ہے اس امر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ کو فرقہ کے اعتراض گراں گزرے ہیں اس لئے جواباً عرض کیا ہے:

”جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے فرقہ اور اسی قسم کا سوال کرنے والے ان تمام بزرگوں اور دوستوں کی تسلی کے لئے میری جانب سے گزارش ہے کہ ہاں بے شک شاہنامہ اسلام ملی جذبہ ہی سے لکھا جا رہا ہے اور اگر جذبہ ملی حب وطن کے منافی اور متفاہنہ ہو تو کسی کے لئے اندیشه

کی وجہ نہیں۔

لیکن یہ کہنا کہ ملی جذبے نے شاعرانہ جذبے کی جگد لے لی ہے
چست فقرہ نہیں۔ یوں کہنا چاہئے تھا کہ شاعر نے اپنے جذبہ ملی کی تسلیم
کے لئے شعر سے کام لیا ہے با غبان نے ضرورت بھی ہے کہ اپنے باغ میں
محض پھول اور سبزہ ہی نہیں بلکہ ایسے درخت بھی لگائے جو سایہ دار بھی
ہوں اور پھل بھی دیں۔ آپ کو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ مقصد پورا ہو رہا
ہے یا نہیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھئے اس کڑی دھوپ میں کتنی مخلوق ان گھنے
درختوں کی چھاؤں میں آسودہ اور خوش حال ہے اور کتنے بے شمار کام و دہن
ہیں جو شاہنامہ اسلام کے اشعار سے لذت یاب ہیں۔ بے شک شاہنامہ
اسلام میرے دوسرے کلام سے بہت مختلف ہے۔^۱

شاہنامہ اسلام پر فراق گورکھپوری نے جو تنقید کی ہے وہ اپنے اندر وزن رکھتی
ہے۔ اگرچہ حفیظ نے الفاظ کے الٹ پھیر سے فراق کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ مگر
بات بنتی نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ شاہنامہ اسلام میں فکر و فن کا امتزاج ہے یا نہیں فکر کی
روح فن کے قالب میں اتری ہے یا نہیں اور اگر اتری ہے تو پر سکون ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو
نہیں کہ فکر کے خطوط فن سے جدا معلوم ہوتے ہیں۔ شاہنامہ اسلام کے مطالعہ سے یہ بات
 واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں فکر و فن کا امتزاج نہیں ہے۔ فکر کی پیش کش میں شعری خوبیوں کو
بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ اظہار و بیان کی وہ شادابی لظر نہیں آتی جو کسی شعری شاہکار کے
لئے ازبکہ ضروری تصور کئے جاتے ہیں۔ انداز و بیان بالکل سپاٹ ہے شعری حسن سے
عاری ہے۔ ابتداء سے انتہا تک رہ گزار کا گمان ہوتا ہے۔ کہیں کوئی مرغزا ر نہیں ہے اس لئے
حفیظ کا یہ کہنا کہ ”شاعر نے اپنے جذبہ ملی کی تسلیم کے لئے شعر سے کام لیا ہے۔“ صحیح نہیں

¹ دیباچہ شاہنامہ اسلام جلد چہارم، صفحہ ۱۱

معلوم ہوتا۔ مجھے اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ جذبہ ملی شعری جذبہ نہیں بن سکتا۔ جذبہ کوئی ہو اگر وہ شعری جذبہ تجربہ بن جاتا ہے تو شاعری اور اچھی شاعری ہے مگر جذبہ کی بلندی و عظمت، شادابی و رنگینی اس کو شعری تجربہ نہیں بن سکتیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ پیرا یہ بیان میں اس شادابی و رنگینی کا عکس ملے جس سے جذبہ کی شادابی و رنگینی عبارت ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی خوف نہیں معلوم ہوتا کہ شاہنامہ اسلام میں شعریت کی کمی ہے۔ اس لئے حفیظ جالندھری کا یہ کہنا کہ ”کتنے بے شمار کام و دہن ہیں جو شاہنامہ اسلام کے اشعار سے لذت یاب ہیں“، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ فکر کی عظمت فن کو عظیم نہیں بن سکتی۔ ممکن ہے کہ مذہب اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے اس کے اشعار پر سرد ہنستے ہوں، آٹھ آٹھ گھنٹہ یکسو ہو کر سنتے ہوں، اس درخت کی چھاؤں میں سکون پاتے ہوں، مگر یہ سب فنی طور پر اس کی بلندی میں اضافہ نہیں کرتے۔ یہ خیال صرف میرا یا فراق گورکپوری کا نہیں ہے بلکہ بہت سے دوسرے اہل قلم حضرات نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ ملک اسماعیل حسن خان نے حفیظ کی شاعری کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں انہوں نے شاہنامہ اسلام پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

”حفیظ کے شاہنامہ کا بھی ایک زمانہ میں بڑا چرچا اور دھوم دھام رہی ہے اور آج بھی حفیظ کا نام آتے ہی ان کے گیتوں کی طرف پہلے دھیان نہیں جاتا بلکہ شاہنامہ کی طرف ذہن مبذول ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ شاہنامہ کو حفیظ کا بڑا کارنامہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کی تاریخ کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے یا اشعار میں محفوظ کر دیا ہے۔ جوش نے اب سے بہت پہلے ہی کہا تھا۔“

واقف بھی ہے آئین تعمق کیا ہے دستور تناسب و تطابق کیا ہے
اسلام کا شاہنامہ لکھنے والے اسلام کو شاہی سے تعلق کیا ہے

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہنامہ میں کون سی خاص بات یا کون سی ایسی خصوصیت ہے جس سے شاعری کو فائدہ پہنچا ہو۔ یہ ضرور ہے کہ اسلامی تاریخ کے بہت سے گوشے اور بہت سے پہلو نظم ہو گئے لیکن اس سے شاعری میں کون سا اضافہ ہوا۔ اس کو منظوم کلام کہا جاسکتا ہے۔ اس میں شعریت کا فقدان ہے اور ظاہر ہے کہ محض کسی واقعہ کو نظم کر دینے سے شاعری ہاتھ میں آ جاتی تو ہر تک بند اور معمولی درجے کا شاعر بھی کر سکتا ہے کہ واقعات کا نقشہ اس کے سامنے ہو اور وہ اس میں اشعار سے رنگ آمیزی کرتا جائے۔^۱

مدو جزر اسلام کے دیباچہ میں حالی نے شاعرانہ انکسار بر تے ہوئے اپنی نظم کے متعلق لکھا ہے:

”ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہر اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہیں کریں گے کیونکہ اس میں یا تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگیں بیانی ہے، نہ مبالغہ کی چاث ہے، نہ تکلف کی چاشنی“^۲

اس کی وجہ بتاتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

”اس نظم کی تربیت مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت و شرم دلانے کے لئے کی گئی ہے۔“^۳

شاہنامہ اسلام جلد چہارم کے دیباچہ میں فراق گورکھپوری اور دوسرے ناقدین کا

۱۔ حفظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خان، جمالستان، دہلی، مارچ ۱۹۶۵، صفحہ ۱۰

۲، ۳۔ دیباچہ مدو جزر اسلام از مولانا حالی

جواب دیتے ہوئے حفیظ نے شاہنامہ اسلام کے اغراض و مقاصد پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

”... وہ لوگ جو اس کتاب کے مخاطب ہیں ہندوستان کے ان
نئے خوابوں کی تعبیر اور اس نئی دنیا کے جنم کے درد و کرب میں اپنے لئے
اپنے پیشوایان ملت ہی کی حیات مبارکہ کے واقعات سے شاہنامہ اسلام ہی
کے ذریعہ انشاء اللہ وہ راستہ پالیں گے جس کی ان کو اس پر آشوب عالم میں
ضرورت ہے۔ ان کو معلوم ہو جائے گا جو کچھ آج پیش آ رہا ہے ایسا ہی کچھ
بلکہ اس سے بہت زیادہ سرمایہ و اقتدار کی طاقتیں کی طرف سے پونے چودہ
سو برس پیشتر ان کے ہادی اعظم اور آپ کے صحابہ کرام کو بھی پیش آ چکا
ہے۔ بہت ہی سادہ الفاظ میں شاعرانہ الجھاؤ اور کسی کی رنگ آمیزی کے
بغیر وہ واقعات نظم کر دئے گئے ہیں جن سے ایسے موقع پر زندہ قومیں
مشکلات پر غالب آ جایا کرتی ہیں۔“

مذکور اسلام اور شاہنامہ اسلام کے اغراض و مقاصد مندرجہ بالا اقتباسات سے
روشن ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قوم کی حالت غیر سے جتنا متاثر حالی ہوئے تھے اس سے کم
حفیظ نہیں ہوئے ہیں۔ مگر حالی کی تحریر میں اثر انگلیزی، صداقت اور خلوص کا دریا زیر یہیں لہر کی
طرح موجود ہے جبکہ حفیظ کی تحریر میں ’جواب آں غزل‘ کا انداز ہے۔ اس میں خلوص
اور اثر انگلیزی کی وہ کیفیت بھی نہیں ہے جو حالی کی تحریر میں ہے۔ میرے خیال میں حالی اور
حفیظ کی نثر میں جو فرق ہے وہی فرق ہر دو حضرات کی شاعری کا بھی ہے۔ باوجود یہ کہ حالی نے
شاعرانہ انگسار سے کام لیتے ہوئے مذکور اسلام کو روکھی پھیکی سادی نظم کہی مگر بہت سے
ناقدوں نے اس کو صداقت پہنچی جانا۔ یہی وجہ ہے کہ مذکور اسلام اردو شاعری میں ایک
تنازعہ فیہ نظم سمجھی جاتی ہے ورنہ اس میں ہر جگہ ریگزار ہی نہیں مرغزار بھی ہیں جبکہ شاہنامہ

اسلام تو فی الواقعہ سادہ الفاظ میں کبھی گئی نظم ہے۔ اس میں شاعری کی کرن ذرا بھی نہیں چمکتی۔ مد و جزر اسلام کی تاثیر کا بین ثبوت تو یہ ہے کہ شاہنامہ اسلام کی تصنیف کے لئے اس نے خشت اول کا کام کیا لیکن شاہنامہ اسلام نقش ثانی کی متوقع خوبیوں سے بھی یکسر عاری ہے۔ بلکہ نقش اول ہی نقش ثانی سے بہتر ہے۔ مندرجہ ذیل میں ہر دو نظموں کے دو چار متحد المضامین بند پیش ہیں تاکہ میرا موقف واضح ہو۔ حالی حضرت محمد ﷺ کی ولادت باسعادت کا ذکر خیر کرتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی خبر حضرت عیسیٰ نے انجلیل میں دی تھی اور حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا کی تھی کہ خدا یا مکہ والوں میں ایک نبی انہی میں سے مبعوث فرم۔ جب ساری دنیا بالخصوص عرب پر کفر و ضلالت کی گھٹا چھا گئی، ہر طرف شر و فساد کا دار دورہ ہو گیا۔ انسان نے تقاضائے بشریت، احکام خداوندی اور اپنے فرائض سے منہ موزا تو آپؓ اس عالم فانی میں مبعوث فرمائے گئے۔ حالی اس واقعہ کو شاعرانہ انداز میں یوں پیش کرتے ہیں:

یک ایک ہوئی غیرت حق کو حرکت
بڑھا جانب بوقیس ابر رحمت
ادا خاک بلطی نے کی وہ ودیعت
چلے آتے تھے دیتے جس کی شہادت
ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا
اس واقعہ کو حفیظ نے یوں ادا کیا ہے۔

خلیل اللہ نے جس کے لئے حق سے دعائیں کیں
ذبح اللہ نے وقت ذبح جس کی التجاہیں کیں

جو بن کر روشنی پھر دیدہ یعقوب میں آیا
جسے یوسف نے اپنے حسن کے نیرنگ میں پایا

کلیم اللہ کا دل روشن ہوا جس ضوفشانی سے
 وہ جس کی آرزو بھڑکی جواب لئے ترانی سے
 وہ جس کے نام سے داؤد نے نغہ سرائی کی
 وہ جس کی یاد میں شاہ سلیمان نے گدائی کی
 دل تیجی میں ارمائی رہ گئے جس کی زیارت کے
 لب عیسیٰ پہ آئے وعظ جس کی شان رحمت کے
 وہ دن آیا کہ پورے ہو گئے تورات کے وعدے
 خدا نے آج ایفا کر دئے ہر بات کے وعدے
 یہ عرض کرنے ضرورت نہیں ہے کہ حالی نے صرف تین اشعار میں بڑے بلیغ طور
 پر جتنی باتیں کہی ہیں وہ شاہنامہ اسلام کے پانچ شعروں میں کہیں سماپتے۔ حالی کے جیسی
 روانی اور شعریت بھی حفیظ کو میر نہیں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ سوچ سوچ کر اشعار
 موزوں کر رہے ہیں اور وزن کا خیال رکھتے ہوئے بہت سے بھرتی کے الفاظ استعمال کرنے
 پر مجبور ہیں جب کہ حالی کے یہاں آمد کا گمان ہوتا ہے۔ خدا نے آج ایفا کر دئے ہر بات
 کے وعدے، میں لفظ بات بے ضرورت آیا ہے۔ نبی کریم صلیعہ کو جب رسالت مبعوث کی گئی
 آپ نے اہل مکہ کو کوہ صفا کے دامن میں جمع کیا۔ خود کوہ صفا پر تشریف لے گئے۔ لوگوں سے
 اپنی صداقت کی تصدیق کرائی۔ حالی نے اس واقعہ کی تصویری کشی مندرجہ ذیل لفظوں میں کی ہے
 وہ فخر عرب زیب محراب و منبر تمام اہل مکہ کو ہمراہ لے کر
 گیا ایک دن حسب فرمان داور سوئے دشت اور چڑھ کے کوہ صفا پر
 یہ فرمایا سب سے کہ اے آل غالب
 سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کہا سب نے قول آج تک تیرا کبھی ہم نے جھوٹانا اور نہ دیکھا
 کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا
 کہ فوج گراں پشت کوہ صفا پر
 پڑی ہے کہ نوٹے تمہیں گھات پا کر
 شاہنامہ اسلام میں اس واقعہ کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔
 چڑھا کوہ صفا پر ایک دن اسلام کا ہادی
 نظر کے سامنے تھی پستی انساں کی آبادی

صدا دی اے قریشی عورتو مردو ادھر آؤ
 یہ اپنے کام دھندے آج تہ کردو ادھر آؤ

گرج کر ابر رحمت کی صدا گنجی ہواں میں
 زمیں سے آسمان تک غلغلہ انھا فضاں میں

صدا سنتے ہی خلقت گھر سے نکلی اس طرف آئی
 بڑی انبوہ در انبوہ دوڑی صف بے صف آئی

اکٹھا ہو گئے آکر جواں و پیر و مرد و زن
 بنی آدم کا جنگل بن گیا یہ کوہ کا دامن

خطاب ان سے پیغمبر نے کیا اے بے خبر بندو
 خلیل اللہ کے پوتو ذبح اللہ کے فرزندو

کھڑا ہوں میں تمہارے سامنے اس کوہ کے سر پر
 عیاں ہے میری آنکھوں پر یہاں دوست کے منظر

اگر میں تم سے یہ کہہ دوں کہ اس کھسار کے پچھے
پھاڑوں کی بلند اور آہنی دیوار کے پچھے

چھپا ہے ایک لشکر آکے تم پر حملہ کرنے کو
تمہاری جان لینے کو لہو میں ہاتھ بھرنے کو

اگر میں تم سے یہ کہہ دوں تو کیا تم مان جاؤ گے
یقین آجائے گا کیا مجھ پہ کوئی شک نہ لاوے گے

کہا لوگوں نے سچا ہے تو یہ جانتے ہیں سب
تو بچپن ہی سے صادق ہے اس کو مانتے ہیں سب

بھلا اس قول پر کیسے یقین ہم کو نہ آئے گا
بلا چون و چرا مانیں گے کوئی شک نہ لائے گا

چھ اشعار میں جس ایجاز و اختصار سے حالی نے اپنا مدعایاں فرمایا ہے حفیظ اس
میں ناکام ہیں۔ سرور کائنات حضور صلم نے اپنی صداقت کی گواہی دلا کر حکم خداوندی سنایا۔
اس واقعہ کو حالی نے مندرجہ ذیل بندوں میں نظم کیا ہے۔

کیا تیری بات کا یاں یقین ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور ایں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے تو سن لو خلاف اس میں اصلاً نہیں ہے
کہ ہر قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

وہ بخلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے جگادی اک آواز میں سوتی بستی جگادی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے
سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا حقیقت کا گزان کو اک اک بتایا
زمانہ کے بگڑے ہوؤں کو بنایا بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا
کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دئے ایک پرده اٹھا کر
اس کے آگے کے سات بندوں میں حالی نے ارشادات نبوی بڑی تصریح سے اور
دنیشیں پیرا یہ بیان میں قلم بند کیا ہے۔
خرد اور اور اک رنجور ہیں وال مہ و مہرا دنی سے مزدور ہیں وال
جهاندار مغلوب و مقہور ہیں وال نبی اور صدیق مجبور ہیں وال
نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی وال
نہ پروا ہے ابرار و احرار کی وال
اس موضوع کو شاہنامہ اسلام میں ملاحظہ فرمائیے۔

یہ سن کر پھر بلند آواز میں سچا نبی بولا اسی انداز سے قرآن ناطق نے دہن کھولا
کہ اے لوگو کہا میرا نہایت غور سے سن لو میں کہتا ہوں کہ باز آجائو ظلم و جور سے سن لو
بیام کی صفت چھوڑ و ذر انسان بن جاؤ برے اعمال سے توبہ کرو شرماد شرماد
فواحش اور زنا کاری مٹادو نیک ہو جاؤ خدا کو ایک مانو اور تم بھی ایک ہو جاؤ
یقوت ولات و عربی کچھ نہیں بے جان پھر ہیں جنہیں تم پوچھتے ہو وہ تو خود تم سے بھی کمتر ہیں
وہی خالق وہی سچا خدا معبد ہے سب کا وہی مطلوب ہے سب کا وہی موجود ہے سب کا
بتوں کی بندگی کے دام سے آزاد ہو جاؤ خدا کے دامن توحید میں آباد ہو جاؤ
پھسا کھا ہے شیطان نے تمہیں باطل کے پھندے میں نہ رکھا فرق تم نے کچھ خدا میں اور بندے میں

تمہارے واسطے میں دولتِ اسلام لایا ہوں جو ابراہیم لائے تھے وہی پیغام لایا ہوں
 خداۓ واحد و قہار پر ایمان لے آؤ جہاں کے مالک و مختار پر ایمان لے آؤ
 جہالتِ چھوڑ دو قرآن پر ایمان لے آؤ بتوں کو توڑو رحمٰن پر ایمان لے آؤ
 اگر ایمان لے آؤ تو نج جاؤ گے اے لوگو فلاج دنیوی و آخری پاؤ گے اے لوگو
 نہ مانو گے تو بربادی کا بادل چھانے والا ہے برا وقت آنے والا ہے برا وقت آنے والا ہے
 حالی کے پیرا یہ بیان اور حفیظ کے پیرا یہ بیان میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ حالی
 نے جہاں بلیغ اشاروں میں بڑی بڑی باتیں کہی ہیں وہاں حفیظ تفصیل میں جا کر بھی ان کو
 بیان نہیں کر پائے ہیں۔ خصوصاً مصرعہ، اک آواز میں سوتی بستی جگادی، اور بہت دن کے سوتے
 ہوؤں کو جگایا اور وہ دکھلا دئے ایک پردہ اٹھا کر، میں جو بلا غلت ہے اس کی مثال نہیں ملتی
 جب کہ حفیظ کے کلام میں ایک مصرعہ بھی اس معیار کا نہیں مدرج راسلام، اسلام کے عروج
 وزوال پر مبنی ہے۔ اس کی جولانگاہ شاہنامہ اسلام کے مقابلہ میں وسیع تر ہے کیونکہ شاہنامہ
 اسلام کا موضوع طوع اسلام سے لے کر جنگ خندق تک ہے۔ اسی لئے حالی اپنی باتیں
 مختصرًا کہتے ہیں جب کہ شاہنامہ میں باتیں پھیلا پھیلا کر کہی گئی ہیں۔ مدرج راسلام بلاشبہ
 مسلمانوں کے عروج وزوال کی کہانی ہے۔ اس کا آغاز بعثت سے قبل کے حالات سے ہوتا
 ہے۔ زمانہ جاہلیت کی گمراہیوں، ضلالتوں، بداعمایوں کا مختصرًا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ عہد مسلمانوں
 کی تاریخ کا حصہ نہیں ہے لیکن امن کی حیثیت تاریخ اسلام کے دیباچہ کی ہے۔ اس پس منظر
 کے بغیر تاریخ اسلام کی حقیقی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ حالی نے اسی اہمیت کے پیش نظر
 زمانہ جاہلیت کے حالات پانچ سات بندوں میں اختصار کے ساتھ یہ بیان کئے ہیں۔ اس کے
 بعد حضورؐ کی ولادت با سعادت، آپؐ کی رسالت اور آپؐ کی تعلیمات کا خاکہ پیش کیا ہے۔
 حضورؐ کی تعلیمات کے زیر اثر مسلم قوم کا ہر فرد راستی، ایمانداری، صلد رحمی، رحم و ہمدردی شجاعت
 و ہمت، ایثار و قربانی، جانفشاںی و جواں مردی، عالی نظر فی و بلند ہمتی، تمیز خیرو شر، باطل سے

نفرت اور خیر سے رغبت وغیرہ خصوصیات جلیلہ سے معمور تھا۔ چنانچہ انہی خصوصیات نے ایک چوتھائی صدی کی مختصر مدت میں دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر مسلمانوں کو مالک و مختار بنا دیا تھا۔ لیکن عروج کا یہ دور دامنی نہ رہا۔ مسلمانوں نے اپنی خصوصیات جلیلہ سے منہ موزا اور ان کی عزت و شان ان سے جدا ہوئی۔ اس کے برخلاف شاہنامہ اسلام میں زیادہ توجہ ان جنگوں کے پر دی گئی ہے جو غزوہات کے نام سے مشہور ہیں۔ ان جنگوں کے تیج تیج میں مسلمانوں کے اوصاف حمیدہ کا ذکر بھی آیا ہے۔ غزوہات پر ضرورت سے زیادہ زور سے یہ گمان ہوتا ہے کہ حفیظ نے اس نظم کو شاہنامہ فردوسی کے انداز پر قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر شاہنامہ فردوسی میں جنگ و جدال کی جو گھن گرج سنائی پڑتی ہے اس سے یہ عاری ہے۔ اس میں انسانی جذبات کی عکاسی بھی اس خوبی سے نہیں ملتی جو معیاری مثنویوں کا خاصہ ہے۔ منظر نگاری کا جہاں تک تعلق ہے وہ بھی ہلکی پھلکی نظر آتی ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر شدت حدت، کے عنوان سے گرمی کا ذکر یوں ملتا ہے۔

یہ اس میدان کا خشک اور رتیلا کنارا تھا
نگاہ ابر رحمت کا اسی جانب اشارہ تھا

قدم نکلنے نہ دیتی تھی زمیں پر دھوپ کی گرمی
قدم آگے بڑھانے میں تھی مانع ریت کی گرمی

اڑی جاتی تھی ریگ دشت گرمی سے ہوا ہو کر
زمیں پر بچھ گئی تھی دھوپ آتش زیر پا ہو کر

ہوا سیما ب مٹی ماہی بے آب تھی گویا
فضا باران رحمت کے لئے بیتا ب تھی گویا

اس گرمی کی شدت میں کمی بارش کے ہونے سے ہوئی۔ بارش کے ہونے کا منظر
ملاحظہ فرمائیں۔

دعا صحراء نے مانگی دامنِ امید پھیلا کر
یک ایک ابر باراں آسمان پر چھا گیا آکر

انہی کی منتظر تھی غالباً شانِ الہی بھی
کہ پیاس سے تھے محمدؐ بھی محمدؐ کے سپاہی بھی

کرم کی شان وابستہ اسی شان کرم سے تھی
یہ رحمت رحمۃ العالمینؐ کے دم قدم سے تھی

مدینے کے بلندی سے جو رحمت کی گھٹا آئی
تو استقبال کو فردوس کی ٹھنڈی ہوا آئی

یہ ریگستان کہ اک اک بوند پانی کو ترستا تھا
اسی پر آج بادل چھا گئے تھے یمنہ برستا تھا

برس کر کھل گیا بادل زمیں پر بھر گیا پانی
ہوئی اب چلنے پھرنے بیٹھنے اٹھنے میں آسانی

ہوئی ٹھنڈی تر دل آب سے چھاتی بیباں کی
تو اتری فرش پر اک فوج آکے اہلِ ایماں کی

کھلے میدان میں سچے بنی کا آستانہ تھا
کہ خاکی فرش تھا اور لا جور دی شامیانہ تھا

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ روشن ہوتا ہے کہ منظر نگاری کی خصوصیات ان میں نہیں ہیں، ان اشعار سے نہ تو گرمی کی شدت کا منظر نظروں میں پھرتا ہے اور نہ بارش کا سماں ہی ابھرتا ہے۔ اسی طرح صحیح صادق کے عنوان سے جو اشعار ملتے ہیں ان میں صحیح کا منظر نہیں ابھرتا۔ صحیح صادق کے ہونے کا بیان صرف پانچ اشعار میں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی قوت تخلیلہ اس کا ساتھ نہیں دے رہی ہے اور وہ جلد از جلد صحیح صادق کے ہونے کا اعلان کر کے اس مضمون سے کنارہ کش ہونا چاہتا ہے ملاحظہ ہو۔

فرشتوں کو نئے احکام بخشے رب عزت نے
کمر کس کے باندھی کار پرداز ان قدرت نے

فلک پر سے اڑا رنگ قمر آہستہ آہستہ
ہویدا ہو چلا نور سحر آہستہ آہستہ

جبین پاک انھی مسجد سے چمکی برق طور آخر
ہو اروئے زمیں پر صحیح صادق کا ظہور آخر

مصلے سے انھا ہادی جگایا جاں ثاروں کو
خدا کے سامنے حاضر کیا طاعت گزاروں کو

صدائے نغمہ توحید گونج انھی فضاوں میں
وہی رفتہ روانی آگئی ساکن ہواں میں

ادا کر لی نماز صحیح اسلامی جماعت نے
تورخ میدان کی جانب کیا فخر رسالت نے

اسی طرح کردار نگاری اور جذبات نگاری بھی اس مثنوی میں بہت خوب نہیں

ہے۔ یہ عرض کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ مثنوی ایک منظوم داستان ہے اور اس لحاظ سے اس میں بہت سے کردار پیش کئے جاتے ہیں جن کی جذبات نگاری کوئی آسان کام نہیں ہے۔ شاہنامہ اسلام کا موضوع اسلام کا آغاز اور ارتقا ہے اس لئے اس میں بے شمار کردار ملتے ہیں۔ اصحاب، حامیان اسلام اور جانشیران رسولؐ کی ایک بڑی تعداد اپنے دل میں ایمان و ایقان کی شمع فروزاں کر کے اپنے ہادی کے جنبش ابر و پر فدا ہونے کے لئے تیار ہے اور دوسری طرف کافروں، ذمیوں، اور مشرکوں کی جماعت چراغ ہدایت کو بجھانے کے درپے ہے۔ اسلام کی جنگیں دراصل اسی پس منظر میں ہوئی ہیں۔

ستیزہ کا رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بوہی

شاہنامہ اسلام میں ان موقع پر فریقین کی جذبات نگاری خوب نہیں ہے۔ بہت ہی سپاٹ انداز میں فریقین کے وہ خیالات اور احساسات ادا کئے گئے ہیں جو تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس لئے اس مثنوی میں ترجمہ کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ اس خیال کو اس وقت اور تقویت ملتی ہے جب حاشیہ میں منظوم کئے گئے خیالات کے حوالے پر نگاہ جاتی ہے۔
مثلاً یہ شعر پڑھئے۔

پر کو جب عدوئے دین محبوب خدا پایا
تو شمشیر پدر نے خون پینے میں مزا پایا

اور اس کی وضاحت کے طور پر حاشیہ میں درج ان الفاظ کو ملاحظہ فرمائیے:

”حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے جواب تک کافر تھے میدان جنگ میں
بڑھے تو حضرت ابی بکرؓ تلوار کھینچ کر ان کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلے
(ذکر عبد الرحمن بن ابی بکرؓ بحوالہ سیرت النبیؐ)“

یہ حال پورے شاہنامہ کا ہے۔ پہلے منظوم خیالات پیش کئے گئے ہیں، اور حاشیہ

میں ان کا مأخذ اور ان خیالات کی نظر دے دی گئی ہے۔ اس پیرایہ بیان سے اس مثنوی کی حیثیت ترجمہ کی سی ہو گئی ہے۔ ایسا کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تاریخ کے اور اق کسی شعری کارنامہ کا موضوع نہیں بن سکتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کے لئے تخیل کی شرط کا پاس نہیں رکھا گیا ہے۔ افکار و خیالات، تجربات و مشاہدات کیے بھی ہوں اور کہیں سے ماخوذ ہوں شاعر اور ادیب اپنے تخیل کی رنجیت سے ان میں قدرت اور دلکشی پیدا کرتا ہے۔ حفیظ اپنی مثنوی میں یہ قدرت اور دلکشی پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہنامہ اسلام سے متعلق ملک اسماعیل حسن خان نے اظہار خیال کیا ہے:

” یہ منظوم کلام ہے، اس کو شعریت سے کوئی علاقہ نہیں، اس میں تاثیر نہیں، خون جگر کی خمود نہیں۔ اس میں ہنی ورزش ہے۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں شاہنامہ دل سے نہیں دماغ سے لکھا گیا ہے۔ یہاں مثالوں سے قطع نظر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ انہیں کے مرشیوں کا اقبال کے شکوہ، جواب شکوہ اور جوش کی حرفاں کے ساتھ مطالعہ کیجئے۔ شعریت وغیر شعریت کا فرق اور معیار آئینہ ہو جائے گا۔ غالباً اسی وجہ سے مولانا ضیا احمد نے اس کو اردو کی دو مدرجے کی نظم کہا ہے۔ مولانا نے مرودت سے کام لیا ہے ورنہ یہ سوم درجے کی نظم بھی نہیں۔ اقبال سے کسی نے شاہنامہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہاں بچوں کے لئے اچھی ہے۔“^۱

اب رہی یہ بات کہ اس کا موضوع اسلام کی تاریخ ہے تو اس سلسلے میں بھی متفاہ آرالیٰ ہیں۔ ملک اسماعیل حسن خان نے اس امر میں رقم کیا ہے:

”شاہنامہ اسلام کی مکمل تاریخ نہیں، اس میں خاص خاص گوشوں اور پہلوؤں کو لیا گیا ہے۔ بعض جگہ بات ادھوری اور بے ربط رہ گئی ہے۔

بعض بیانات تشنہ ہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم اس کا مطالعہ کرے تو وہ بعض غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے، بعض باقی مہم ہیں۔ اجمال و اختصار نے شاعر کو تاریخ نویسی کے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہونے دیا۔ وہ تفصیلات میں نہیں جاتا، سیدھا آسان راستہ اختیار کرتا ہے لیکن اس سے تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے، زنجیر کی بہت سی کڑیاں غائب ہو جاتی ہیں۔ جانا بوجھا ذہن تشنگی محسوس کرتا ہے۔ فردوسی نے رسم و سہراب کی مختصری داستان کو اتنا پھیلا کر بیان کیا ہے کہ ایران کی تہذیب و معاشرت، سوسائٹی و حکومت، رزم و بزم کا شاید ہی کوئی پہلو اور گوشہ چھوٹا ہو۔ اگرچہ فردوسی کو بہت سے واقعات و حادثات خود ذہن سے گزھنا پڑے ہیں۔ اس کے سامنے لکھا لکھایا تاریخ کا دفتر موجود نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس نے جزیات کو نہیں چھوڑا۔ جتنا مواد اور ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت اور تعجب ہوتا ہے۔ لیکن شاہنامہ اسلام کے سامنے تو یہ وقت بالکل نہ تھی۔ موافقین و مخالفین و صحابہ و ائمہ کی لکھی ہوئی سیکڑوں تاریخیں، تذکرے، احادیث، خطبات اور دوسری کتابیں ملتی ہیں جن میں بات آئینہ کی طرح صاف اور واضح ہے۔ ہر گوشہ، ہر پہلو، موز بے نقاب ہے۔ فردوسی نے قطرہ کو وہ بسط دیا کہ قلزم کر دکھایا ہے لیکن حفیظ صاحب نے قلزم کو وہ اختصار عطا کیا کہ کوزے میں بند کر دیا۔ فردوسی کے پاس مواد کم تھا مگر اس نے اپنی قوت اختراع، زور بیان اور قادر الکلامی سے اسے بڑھا چڑھا کر اتنے وسیع پیانے پر پیش کیا کہ باید و شاید اور ہمارے شاہنامہ کے مصنف نے اسلام کی اتنی وسیع اور طویل و عریض تاریخ کو اپنی کم گوئی کے باعث اتنا گھٹا کر پیش کیا کہ بعض ضروری اور اہم پہلوؤں کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا اور ان سے صرف

نظر کیا۔“ ۱

شاہنامہ فردوسی کے مقابلے میں شاہنامہ اسلام کی حقیقت مندرجہ بالاتر یہ کے مطالعہ سے واضح ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں تعجب اس امر پر ہوتا ہے کہ حفیظ نے اپنے دیباچہ میں اپنی مثنوی کی تعریف میں بڑی بڑی باتیں رقم کی ہیں۔ مثنوی نگاری کے معیاروں پر یہ مثنوی کھری نہیں اترتی لیکن حفیظ نے دعوے بڑے بڑے کئے ہیں:

” یہ ایک قلعہ ہے جو فولادی اور سنگلاخ بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اس کی دیواریں پھول پتی سے نہیں اٹھائی گئی ہیں۔ اس کے بروج کو غمیم حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ ان بھاری پتھروں کی تراش خراش اور ان کو محل مناسب پر جمانے کے لئے جو صنعت اور مہارت استعمال کی گئی ہے وہ فن شیشه گری سے الگ ہے۔ اس قلعہ کا حسن اس کے رعب مابہیت اور وقار میں ہے نازکی اور پچ میں نہیں کیونکہ یہاں نازکی اور پچ کمزوری پر دلالت کریں گی۔“ ۲

حقیقت یہ ہے کہ شاہنامہ اسلام نہ تو فولاد اور سنگلاخ بنیادوں پر قائم مضبوط قلعہ ہے اور نہ یہاں شیشه گری کے فن سے کام لیا گیا ہے۔ اس وجہ سے نہ تو شعری دلکشی ملتی ہے اور نہ واقعات ہی مہتم بالشان ہو پائے ہیں۔ بہت ہی سرسری طور پر تاریخ اسلام کے چند اوراق پر یہاں کو نظم کر کے اس کا نام شاہنامہ اسلام رکھ دیا گیا ہے اور برخود غلط اس کو عظیم کار نامہ تصور کر لیا گیا ہے۔ البتہ جہاں جہاں حضور کی منقبت ہے وہاں وہاں شعری دلکشی ملتی ہے۔ انہی حصوں کو پڑھ کر حفیظ کو شاعر ماننے کے لئے دل آمادہ ہوتا ہے وہ نہ پورا شاہنامہ سادہ اور سپاٹ ہے۔ جلد اول میں حضور سرور کائنات کی ولادت با سعادت پر جو سلام لکھا ہے

۱۔ حفیظ کی شاعری از ملک امیل حسن خان جمالستان، دہلی، ماوج ۱۹۶۵

۲۔ دیباچہ شاہنامہ اسلام جلد چہارم، صفحہ ۱۲

وہ خاصے کی چیز ہے اور بہت مقبول و مشہور ہے اکثر میلاد کی محفلوں میں یہ نظم پڑھی جاتی ہے۔
چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب بجانی سلام اے فخر موجودات فخر نوع انسانی
سلام اے ظل رحمانی سلام اے نور یزدانی ترانقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی
حفیظ بے نوابھی ہے گدائے دامن دولت عقیدت کی جبیں تیری مردست سے ہے نورانی
تیرادر ہو مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو تمنا مختصر ہی ہے مگر تمہید طولانی
سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

یہاں یہ بات روشن ہوتی ہے کہ مثنوی نگار کی حیثیت سے حفیظ جالندھری ناکام ہیں۔ ان کا شاہنامہ حالی کی مثنوی مدوجزہ اسلام کے مقابلہ میں بہت کمتر درجہ کی چیز ہے۔ ایسی صورت حال میں اس کا موازنہ شاہنامہ فردوسی سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے شعری اور فنی نقاصل کے علاوہ جن سے اوپر بحث کی گئی ہے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا موضوع اسلام کی مکمل تاریخ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مجنون گورکھپوری کے اس جملے پر اس بحث کو ختم کرنا مناسب لگتا ہے۔

”(حفیظ) انہوں نے ایسی چیز کو ہاتھ لگایا جس میں مطالعہ کی ضرورت تھی مگر شاہنامہ میں صرف سنی سنائی باتیں ہیں۔“ ۱

* * *

غزل گوئی

یہ امر واقعہ ہے کہ اردو شاعری کی دنیا میں حفیظ گیتوں اور نغموں کے راستے سے داخل ہوئے اور جب اپنی ساکھ بھائی تو غزلیں کہیں۔ اس بات سے اس دھوکے میں نہیں پڑنا چاہئے کہ حفیظ غزل کو دوسرے درجے کی شاعری قرار دیتے تھے بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غزل گوئی کے کوچے میں وہ بہت سنبھل سنبھل کر قدم رکھنا چاہتے تھے۔ حفیظ کسی خاص مکتب خیال سے مسلک نہیں رہے۔ انہوں نے فنکاری اس لئے کی کہ ان کو فنکاری کرنا تھی۔ ان کے پیش نظر وہی مقاصد تھے جو ان کی شخصیت میں رچ بس کر اس کے اجزا ہو گئے تھے۔ اس لئے حفیظ کی غزلیں ہوں یا گیت یا نظمیں ہر جگہ ان کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں اس کی دھڑکن صاف ناٹی دیتی ہے اور کہیں اس کی آواز مدھم معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ تمام اصناف شاعری پر اور ہر موقع محل سے خیالات کو شعری پیکر عطا کرنے کی یکساں قدرت کسی فنکار کو نہیں ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر جیسے شہنشاہ تغزل کی شاعری بلندیش غایت بلند پستیش غایت پست کے زمرے میں آتی ہے۔

حفیظ کے جتنے مجموعہ ہائے کلام شائع ہوئے ہیں ان میں نظموں اور گیتوں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ ان کے علاوہ چند غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان پر روایت کی گہری چھاپ ہے۔ ان کے موضوعات حسن و عشق، بہار و شباب، شخ و مختسب، گل و بلبل، ہجر و

وصال، گلشن و صمرا، جام و شراب، جنون و ہوس، جبر و اختیار، مرگ و زیست، شام و سحر، قفس و آشیاں وغیرہ ہیں۔ آج غزل نے اپنا دائرہ کار عشق و محبت کے کوچے سے سوا کر لیا ہے تو حفیظ کی غزلیں بھی اپنے اندر گھری معنویت رکھتی ہیں۔ عصری حیات اور ارد گرد کے ماحول کے نقوش ان میں جھلملاتے ہیں۔ بظاہر یہ بڑی سپاٹ اور روایتی انداز کی حامل ہیں مگر معنی کی پرت ادھیزیں تو یہ اپنے اندر وسعت و گہرائی بھی رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے میمجر سید ضمیر جعفری نے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

”واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک گیت اور نظم کی طرح غزل میں بھی حفیظ ایک نمایاں انفرادیت، ایک مخصوص طرز، ایک خاص لب و ہجہ اور ایک اپنا ہی رنگ رکھتا ہے۔ اس کی غزل میں دل اور روح، سوز و گداز، شیریٰ اور تاشیر، درد اور کسک غرض کہ وہ سب باتیں ہیں جن سے کلاسیکی غزل کا خمیر اٹھتا ہے اور ان کے علاوہ اور ان سب سے بڑھ کر ہیں وہ پرکار سادگی اور زندگی کے ساتھ بے پناہ خلوص جو حفیظ کی خالص اپنی چیزیں ہیں۔

حفیظ کی ابتدائی غزلوں میں داغ کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس نے وہ سادگی، صفائی، سلجنھا و گھلاؤث اور ایک قسم کا شوخ و شنگ امرت بخشنا جو بعد میں حفیظ کی غزل کا نشان امتیاز بن گیا لیکن داغ کا رنگ صرف اسلوب تک محدود رہا۔ غزل کی روح اس کی اپنی رہی۔

حفیظ ان شعرا میں سے ہیں جو اپنا راستہ ساتھ لاتے ہیں، خود بناتے ہیں۔ چنانچہ ^{کنگھی} چوٹی کے اس زمانے میں حفیظ نے اپنی غزل کی بنیاد زندگی کے سچے محسوسات اور اس کی ہمہ گیر سچائیوں پر استوار کی۔ اس کی غزل حتیٰ کہ شباب میں بھی محض عورتوں سے بات چیت نہ بن سکی۔

حسن و عشق کی سطحی معاملہ بندیوں میں بھی اس نے ایک الگ

راستہ اختیار کیا ہے جسے میں طہارت فکر یا پا کیزگی ذوق کا راستہ کھوں گا۔^۱ لے
مندرجہ بالا اقتباس پر نگاہ ڈالنے تو محسوس ہوتا ہے کہ حفیظ کی غزلوں میں انفرادیت
بھی ہے، سادگی و پُر کاری بھی، شیرینی و نغمہ ریزی بھی اور معنی آفرینی بھی۔ اس طرح حفیظ کی
غزلیں ایک طرف روایت سے رشتہ استوار کرتی ہیں اور دوسری طرف عصری حیات سے اپنا
تعلق قائم کرتی ہیں۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں معنی آفرینی اور فلسفیانہ موشگافیاں اس انداز اور
قبيل کی نہیں ہیں جو غالب اور اقبال کا طرہ امتیاز ہے۔ حفیظ کی غزلوں میں خیالات کے بلکہ
پہلے خطوط ملتے ہیں لیکن یہ خطوط موسيقی اور ترجمہ ریزی میں بے مثال ہیں۔ اسی وجہ سے
انہوں نے اپنی شاعری سے متعلق ایک غزل میں کہا ہے۔

اس بزم میں آخر شعرا ہیں کہ نہیں ہیں
انداز میرے سب سے جدا ہیں کہ نہیں ہیں
لیکن ملک اسماعیل حسن خان نے حفیظ کے اس خیال کی ختنی سے تردید کی ہے۔
انہوں نے حفیظ کی غزلوں کو کسی قسم کی ندرت وجدت سے یکسر خالی بتایا ہے۔ ان کا خیال ہے:
”انداز میرے سب سے جدا ہیں کہ نہیں ہیں یہ دعویٰ انہوں نے
اپنی غزلوں کے متعلق کیا ہے جو صحیح نہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں جو
 مضامین بیان کئے ہیں وہ سب کے سب تقریباً روایتی ہیں۔ ان میں نہ فکر و
خیال کی جدت و ندرت نظر آتی ہے نہ اسلوب بیان کی تازگی و طرفلگی، وہ
رسیلا اور ترجمہ ریز انداز بھی نہیں جو ان کی بعض گیتوں یا نظموں میں ملتا ہے۔
یہ بات میں ان کی سب غزلوں کے پیش نظر کہہ رہا ہوں۔“^۲

ملک اسماعیل حسن خان کے برعکس ڈاکٹر عبداللہ حفیظ کی شاعری میں نالہ دل کے

۱۔ حفیظ۔ ایک نئی آواز از میجر سید ضمیر جعفری، افکار، لاہور، صفحہ ۱۲

۲۔ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خان جمالستان دہلی ۱۹۶۵، صفحہ ۱۳

علاوہ نغمہ درباب کی جھلک بھی دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے:

”ہمیں حفیظ کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کہ ان کی شاعری محض نالہ دل
ہے نغمہ درباب نہیں۔ وہ شاعر ہی کیا جس کی شاعری میں نالہ دل اور نغمہ و
رباب مل جل کر سامنے نہ آئیں۔ شاعری تو ایک لحاظ سے ہے ہی موسیقی
اور موسیقی بھی اس نوع کی کہ اس کو کان کے علاوہ دل بھی سن سکتا ہے۔ شعر
کی ایک داخلی موسیقی بھی ہوتی ہے جس کو گائے بغیر بھی گایا جاسکتا ہے اور
سنا یا جاسکتا ہے اور اگر شاعری کبھی اپنی اندر ولی موسیقی کے علاوہ نغمہ درباب
کی بھی ہم قدم بن جائے تو اسے عیب نہ کہنے کیونکہ یہ تو وہ ہنر ہے جو شعر کو
دواستہ بنادیتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حفیظ کی شاعری نامہ دل بھی ہے اور نغمہ
ورباب بھی۔“^۱

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ حفیظ کی غزلوں میں تفکر و فلسفہ کا وہ رنگ نہیں ملتا ہے
جو غالب اور اقبال کی غزلوں میں ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حفیظ کی شاعری اپنے اندر اتنی
معنویت اور گہرائی نہیں رکھتی مگر اقبال کے بعد جن شعراء نے اردو شاعری کے آسمان کو اپنی
تابانی سے منور کیا ہے ان میں حفیظ کا رنگ دوسروں سے جدا ضرور ہے۔ حفیظ کی غزل میں
نغمگی، موسیقی، ترجمہ ریزی کے ساتھ ساتھ فلکر و فلسفہ کے بہت ہلکے خطوط نظر آتے ہیں۔ ان
میں عصری حیات کے رنگ دنور قوس قزح کی طرح بکھر گئے ہیں۔ ان میں محبوب کے حسن کی
گرمی ہے، اس کی رعنائیاں ہیں، اس کی جلوہ نمایاں ہیں۔ اس حیثیت سے حفیظ کی غزلیں
دوسروں سے امتیاز رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حفیظ کے ایک دوسرے ناقہ فضیل جعفری نے
ان کی غزلوں کو اس طرح خرائح عقیدت پیش کیا ہے:

”نغمہ زار کی غزلوں میں برق حسن کا مہکتا ہوا شعلہ، چٹلی زندگی

¹ حفیظ کی شاعری نالہ پابند لے از ڈاکٹر عبد اللہ، افکار، حفیظ نمبر لاہور، صفحہ ۳۹۸

کی شادمانیاں کنوں جیسی خوبصورت نگاہوں کے افسانے، شعلہ سحر کی تابندگی،
شفق کی گلکاریاں، الفاظ کی لطیف جگہاں میں، محبوب کی زلف خم بخم کی
رعنا دیاں، نرگس نیم باز کا خمار، حیات و کائنات کے رموز و اسرار سے واقفیت،
وجدان و جمال کے سہارے آگے بڑھنے والے جذبات کے نرم دھارے،
احساسات کی پاکیزگی اور بانگمپن، جذبہ عشق کی کجھ کلاہی، دلوں کو چرا لینے
والی ادائیں اور سرستی، خود کو پالینے کی اتحادگان، آواز کی موسیقی سے پیدا
ہونے والی تحریر اہت، مده میں ڈوبی رسیلی تانوں کی گنگناہت اور اس
طرح کے دوسرے اہم تر اور خالص شعری عناصر یوں رچ بس گئے ہیں کہ
ٹھہر ٹھہر کر غور کرنے اور رک رک کر سوچنے والا ذہن حفیظ کی غزوں کی
انفرادیت اور اہمیت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔^۱

فضیل جعفری کے اس خیال سے کہ حفیظ کی غزوں کا مطالعہ ٹھہر ٹھہر کر غور کرنے
اور رک رک کر سوچنے والے، ذہن سے کرنے پر ان کی انفرادیت اور ندرت وجدت کا
ادراک ہو سکتا ہے اس غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہئے کہ ملک اسماعیل حسن خان نے حفیظ کی
غزوں کا مطالعہ بغور نہیں کیا ہے۔ ملک اسماعیل حسن خان نے حفیظ کی غزوں کا مطالعہ بغور
کیا ہے اور وہ ان میں کسی قسم کی ندرت یا جدت دیکھنے سے قاصر ہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے
کہ غزل کا جو معیار ملک اسماعیل حسن خان نے اپنے ذہن میں رکھا ہے وہ معیار فضیل جعفری
کے ذہن میں نہیں ہے۔ میرے خیال میں شعروادب کی سطح پر اس طرح متضاد خیالات غلط
نہیں ہیں۔ اس طرح شعروادب کے دبتانوں میں نئی راہیں کھلتی ہیں۔ غور و فکر کا نیا سورج
طلوع ہوتا ہے۔ بہر حال ملک اسماعیل حسن خان اور فضیل جعفری کے خیالات دو انتہاؤں
کے حامل ہیں۔ فضیل جعفری حفیظ کی غزل میں خوبیاں ہی خوبیاں پاتے ہیں جبکہ ملک اسماعیل

حسن خامیاں ہی خامیاں۔ ظاہر ہے کہ حقیقت انتہاؤں پر نہیں ہوتی، اس کی پسندیدہ جگہ وسط ہے۔ اس لئے ملک اسماعیل حسن خان اور فضیل جعفری کے خیالات کے درمیان کوئی لفظ اگر ہم تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو سمجھنا چاہئے کہ حفیظ کی غزلوں سے ہم صحیح طور پر لطف انداز ہو سکے اور ان کا صحیح ادراک کر سکے۔

حفیظ کی غزلیں اپنی سادگی و پرکاری، شیرینی و ترنم اور عصری حیثت کی گھلاؤٹ کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ یہ خصوصیات ان کی غزلوں میں عام ہیں۔ ان کے ہم عصر دوسرے غزل گویوں کے یہاں یہ خصوصیات اس درجے کو نہیں جس درجے کی حفیظ کی غزلوں میں ہیں۔
چند اشعار سے میرا موقف واضح ہو جائے گا۔

ناصح کو بلاو میرا ایمان سنجاۓ
پھر دیکھ لیا اس نے شرارت کی نظر سے

ضبط میرا طالب دیدار ہو جاتا اگر
دیکھتا موئی مجھے، سینا مجھے، جلوہ مجھے

جوہیٰ تسلیوں سے نہ بہلاؤ، جاؤ جاؤ
جاو کہ تم نہیں ہو میرے اختیار میں

کس قدر نا آشنا کھلے مآل عشق سے
کر گئے جو وضع رسم عاشقی میرے لئے

وہ گرم سیر گلتاں ادھر رقیب کے ساتھ
ادھر ہے پائے نگہ اور واڈی پر خار

یاس کی بستی میں اک جھوٹی سی امید وصال
اجنبی کی طرح سے پھرتی ہے گھبرائی ہوئی

●
اغیار سے بھی کرنے لگے وعدہ ہائے حشر
عادت بگاڑ دی ہے میرے اعتبار نے

●
نازک مزاج پھول کا منھ سرخ ہو گیا
چکنی سی ایک لی تھی نیم بہار نے

●
وہ ہم نہیں کہ مریں عمر جاؤ داں کے لئے
دعائیں مانگتے ہیں مرگ ناگہاں کے لئے

●
غضب تھا وہ مریض غم کی حالت کا بدل جانا
وہ رو دینا کسی نامہرباں کا مہرباں ہو کر

●
مجھے ڈر ہے گلوں کے بوجھ سے مرقد نہ دب جائے
انہیں عادت ہے جب آنا ضرور احسان دھر جانا

●
اس دار فنا میں مری ہستی کوئی دیکھے
اک دم کا بھروسہ ہے جو اک دم میں فنا ہو

●
اے میرے رونے والو خدارا جواب دو
وہ بار بار پوچھتے ہیں کون مر گیا

دیدوں نے کھوئی ضبط محبت کی آبرو
کمحبت ان کے سامنے نمناک ہو گئے

•
ہجوم آرزو سے شہر دل آباد کرتے ہیں
ہم اپنی خاک اپنے ہاتھ سے برباد کرتے ہیں

•
لگایا اس لئے آئینہ اس نے روزن در میں
کہ اپنا منھ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

•
گردن غیر میں ہیں ہاتھ حمال ان کے
ہاں گلا گھونٹ کمند رگ گردن میرا

•
حال یہ ہے کہ ہم غریبوں کا
حال تم نے کبھی سنا ہی نہیں

کیا چلے زور دست وحشت کا
ہم نے دامن کبھی سیا ہی نہیں

دوست ہی دوستی نہیں کرتے
وشنوں کا تو کچھ گلہ ہی نہیں

حفیظ کی غزلوں سے پیش کئے گئے مندرجہ بالا اشعار اپنے اندر کشش رکھتے ہیں۔
ان میں تاثیر ہے۔ یہ اپنی طرف بلا تے ہیں اور اپنی تازگی و ندرت سے متاثر کرتے ہیں۔ ان
میں بلا کی سادگی ہے۔ ان میں خیالات فن کی قبائل سمجھتے ہیں۔ ان میں خلوص ملتا ہے۔ یہ دل
کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں اگرچہ داغ کا اثر ملتا ہے

مگر یہ بدنام نہیں معلوم ہوتے یہاں افکار و خیالات کی پیش کش میں الفاظ کی تکرار حسن پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے اس طرزِ ادا کا استعمال عیب نہیں بنتا بلکہ خوبی بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فضیل جعفری نے حفیظ کی غزلوں کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

”حفیظ کی وسیع انظری اور ذاتی بلندی نے ان کی غزلوں میں ایسے امکانات اور وسعتیں پیدا کر دی ہیں جو خالص عشقیہ جذبات کا نتیجہ ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل درست ہے کہ عشق و محبت کے خمیر سے پیدا ہونے والی کیفیات تمام انسانی جذبات و احساسات میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر نرم و ریشمی الفاظ کے لبادوں میں لپٹنے ہوئے جذبوں کے بل بوتے پرہی بڑی شاعری نہیں کی جاسکتی۔ غزل میں وسعت، عظمت، سنجیدگی، گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ رسمی رومانیت سے کنارہ کشی کی جائے۔ حفیظ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر بہر حال اس کی بات کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی غزلیں حیات و کائنات کے مخصوص ارتقائی عمل سے ہم آہنگ ہیں اور ان میں ایک خاص قسم کی تملکت اور پھیلاؤ ملتا ہے۔“^۱

اس صورت حال میں میں ملک اسماعیل حسن خان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتی جوانہوں نے حفیظ کی غزلوں سے متعلق اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

”ان کی غزلوں میں چونکا دینے والی بات نہیں ملتی۔ ان میں کوئی خصوصیات بھی نہیں جسے خاص انہی کی ایجاد کہا جاسکے۔ جذبات دل کو وہ پابند نہیں کر سکے ہیں۔ یہ نطق کے موجود پر غالی سیپوں کی حیثیت رکھتے

¹ نغمہ زار کی غزلیں، از فضیل جعفری، حفیظ نمبر افکار، لاہور، صفحہ ۵۳۸

ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعی تاثر نشاطیہ اور طرب انگیز ہے۔ البتہ کہیں کہیں لکھنے کے غزل گوشرا کی وہ خصوصیت ضرور ملتی ہے جس کو ہم مرثیت کہہ سکتے ہیں۔، ناخ و آتش اور ان کے شاگردوں نے غزل کو لفظی شعبدہ بازی یعنی فنکاری کا ذریعہ بنایا تھا۔^۱

لفظی بازی گری صرف اس وجہ سے قابل اعتراض چیز نہیں ہے کہ وہ لفظی بازی گری ہے۔ اظہار و بیان کی وہ ایک طرز ہے۔ اگر خیالات اس طرز میں صحیح طور پر ادا ہوئے ہوں تو وہ حسن ادا ہیں۔ اس لحاظ سے حفیظ کی غزلوں میں لفظی بازی گری نے حسن کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ حرمت کی بات ہے کہ جب حفیظ اپنی شاعری کو نالہ دل کہتے ہیں تو ڈاکٹر عبداللہ ان کے خیال سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی شاعری میں نغمہ در باب ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ملک اسماعیل حسن خان اس میں نالہ دل بھی نہیں پاتے ہیں۔ حفیظ کی غزلوں پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے ملک اسماعیل حسن خان نے ان کو یکسر روایت کہہ کر لاائق اعتمان نہیں قرار دیا ہے۔ اپنے بچاؤ کے لئے ایک راہ یہ ڈھونڈی ہے کہ دس بیس اشعار کی بات نہیں کرتے میرا خیال ہے کہ یہ نقطہ نظر منفی ہے۔ اکثر غزل گوشاعروں کے پاس چند اشعار ہی ہوتے ہیں جو ان کی بقاء دوام کے ضامن ہوتے ہیں۔ میر کی شاعری کے بارے میں یہ رائے عمومیت حاصل کر چکی ہے کہ بلند پش غایت بلند و پستیش غایت پست۔ ملک اسماعیل حسن خان کے خیال کے مطابق میر کے تمام اشعار بلندی کے حامل ہونے چاہیں۔ لیکن اس بات سے میر کی شہنشاہیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ملک حسن خان کے اس خیال سے کہ دس بیس اشعار کو چھوڑ کر حفیظ کی غزلیں تاثیر اور قدرت سے عاری ہیں، حفیظ کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس کے علاوہ دس بیس کی کوئی حد متعین نہیں کی جاسکتی۔ سود و سوا اشعار بھی دس بیس کے زمرے میں آتے ہیں اور واقعی دس بیس اشعار بھی۔ یہ ایک عمومی تبصرہ ہے جو شواہد اور دلائل

^۱ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خان 'جمالتان دہلی'، مارچ ۱۹۶۵ صفحہ ۱۲

کی میزان پر پورا نہیں اترتا۔

ملک اسماعیل حسن خان نے حفیظ کے ان اشعار کو لاٹ توجہ نہیں قرار دیا ہے جن میں عشق و محبت کی چھیر چھاڑ ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ نکالی ہے کہ اپنے ایسے اشعار سے متعلق حفیظ کا خیال ہے:

دیکھا نہ کاروبار محبت کبھی حفیظ

فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے

بالغرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حفیظ نے واقعتاً کسی حسین سے محبت نہیں کی ہے تو بھی ان کے ایسے اشعار کیوں کر لاٹ توجہ نہیں ہیں جن میں عشق و محبت کی کیفیات کا ذکر ہے۔ ایسی صورت میں اردو کے بہت سے غزل گو پایہ اعتبار سے گر جائیں گے۔ اس کے علاوہ عشق کرنے کے لئے ارضی معشوق کے علاوہ اردو شاعری میں ایک سماوی معشوق بھی ہے۔ بہتوں نے معشوقِ حقیقی سے لوگا کر عشق کا مزہ پایا ہے۔ پھر حفیظ نے ایک خاتون سے شادی کی تھی۔ میرے خیال میں یہ شادی عشق و محبت کی شادی ہے۔ اس صورت حال میں حفیظ کے عشقیہ اشعار کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ:

”ان کو کاروبار محبت سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ اس کا ان کو کوئی

تجربہ نہیں، انہوں نے جو حدیثِ لب و رخسار بیان کی ہے وہ صداقت و تاثیر

سے سوا ہے۔ اس میں خلوص نہیں، اثر نہیں، کیفیت نہیں، دلکش نغمگی نہیں،

یہ کاغذی پھول ہیں۔ کاروبار دہرنے انہیں فرصت کا وقت ہی نہ دیا کہ وہ

محبت جیسی شیریں دیوانگی سے کبھی آشنا یا لذت گیر ہو سکتے، اسی لئے ان کا

تعزل پھیکا اور بے مزہ ہے۔ اس میں کیفیت نہیں، محبت کا عرفان نہیں۔ دل

کی دھڑکنیں اور ان کی آنچ نہیں، وہ براۓ شعر گفتگو کا مصدقہ ہے۔“^۱

^۱ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خان، جمالستان، دہلی مارچ ۱۹۶۵، صفحہ ۱۵

اگر ملک اسماعیل حسن خان کے اس خیال سے اور باتوں سے چشم پوشی کر کے
اتفاق کر لیا جائے تو ان اشعار کی دلکشی، اثر انگلیزی، جاذبیت اور کیف آگیں سے کیسے انکار
کیا جاسکتا ہے۔

ندامت ہوئی حشر میں جن کے بدے
جوانی کی دو چار نادانیاں ہیں

محبت کرو اور نباہو تو بوجھوں
یہ دشواریاں ہیں کہ آسانیاں ہیں

اس فتنہ شباب کا عالم نہ پوچھنے
اک حشر اٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے

بھلا دو مجھ کو لیکن یاد رکھنا
ستائے گی تمہیں بھی یاد میری

ساتا ہے کیا حرمت انگلیز قصے
حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی

حشر کے دن میری چپ کا ماجرا
کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

مجھے بھی تک رہی ہیں اب وہ آنکھیں جن کے جادو سے
غزال حرم آوازہ ہیں کوہ بیاباں میں

کل ضرور آؤ گے لیکن آج کیا کروں
بڑھ رہا ہے قلب کا اختلاج کیا کروں

●
اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سمجھی میں تو بے حجاب نہیں

●
ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

●
یا پردہ اٹھادے رخ جانانہ دکھا دے
یا ذوقِ نظر سے مجھے بے گانہ بنادے

●
ہم خون جگر پی کے چلے جائیں گے ساتی
لے شیشہ دل توڑ دے پکانہ بنادے

●
جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح عقل کی بات بتاتا جا

●
نقشِ وفات میں ہی تھی، اب مجھے ڈھونڈتے کیا ہو
حرف غلط نظر پڑا تم نے مجھے منادیا

●
پیار کی باتیں وصل کی راتیں یاد کرو گے یاد کرو گے
کس دل سے آباد کیا تھا کس دل سے بر باد کرو گے
اور تمہیں آتا ہی کیا ہے کوئی ستم ایجاد کرو گے

جنوں سے نہ الجھیں ابھی اہل دانش
ابھی کچھ دنوں عقل کی خاک چھانیں



ہائے کس درد سے کی ضبط کی تلقین مجھے
ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا



وفا جس سے کی بے وفا ہو گیا جسے بت بنایا خدا ہو گیا
یہاں ہم دعائیں ہی کرتے رہے وہاں اس نے جو کہہ دیا ہو گیا
ان اشعار میں ایک عاشق کا دل دھڑکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان شعروں کو
فن کے قالب میں اتارنے والا عشق کے رموز و نکات سے واقف ہے۔ محبوب کے مراتب
کا بھی اسے خیال ہے اور اپنی کم مائیگی کا بھی۔ اپنی نیازمندی اور محبوب کے ناز سے بھی آگاہ
ہے۔ عشق و محبت کے جلوہ ہائے رنگیں اس کی نگاہوں میں ہیں۔ ان اشعار کو آسانی سے عشق
حقیقی اور عشق مجازی پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان کو عشق حقیقی سے معمور بھی تصور کر لیا تو ان
کی جاذبیت، دلکشی، ترنم ریزی اور کیف انگیزی سے انکار حقیقت کے منافی ہو گا۔ تلخاہ
شیریں کی ایک غزل میں حفیظ نے اپنی گمراہی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا
ہے کہ سفر گلتاں میں ان کے قدم میں لغزش آتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

اٹھائے کیوں نہ طوفان ملامت عاشقی اپنی
سمندر پار سے لا یا ہے دل اپنا خوشی اپنی

اس شعر کو کس طرح عرفان سے قریب کر سکتے ہیں۔ ان باتوں کی روشنی میں یہی
کہا جاسکتا ہے کہ حفیظ کے عشقیہ اشعار میں ان کا دل دھڑکتا ہے۔ ان میں تاثیر ہے، سادگی
ہے اور خلوص ہے۔

حفیظ کی غزلوں میں ایک ایسی خصوصیت بھی ہے جو ان کو ان کے معاصر غزل گویوں میں ممتاز کرتی ہے وہ خصوصیت ہے ان کا ڈرامائی انداز بیان۔ اکثر اشعار میں یہ انداز بیان ملتا ہے۔ ان میں اسی طرح بے تکلفی پائی جاتی ہے جس طرح کی بے تکلفی غالب کے خطوط میں۔ ان میں ویسی ہی سادگی اور پرکاری ہے جیسی سادگی و پرکاری غالب کے خطوط میں۔ میں نے ایسے اشعار بھی یہاں نقل کئے ہیں جن میں حفیظ کی اور خصوصیتوں کے علاوہ یہ خصوصیت بھی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حفیظ کے اشعار میں نادر تشبیہیں بھی ملتی ہیں۔ انہوں نے ایسی تشبیہیں ایجاد کی ہیں جو ان کے خیالات کی ادائیگی میں معاون ہوتی ہیں۔ مثلاً ان اشعار میں بعض ترکیبیں پر نگاہ ڈالیے تو ان کی ندرت اور جدت پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے۔

آغازِ مصیبت ہوتا ہے اپنے ہی دل کی شرارت سے
آنکھوں میں پھول کھلاتا ہے، تلووں میں کائنے بوتا ہے
احباب کا شکوہ کیا کیجھے، خود ظاہر و باطن ایک نہیں
لب اوپر اوپر ہنتے ہیں دل اندر اندر روتا ہے
آنکھوں میں پھول کھانا، تلووں میں کائنے بونا، لب کا اوپر اوپر ہنسنا اور دل کا اندر
اندر رونا واقعنا ایسی ترکیبیں اور تشبیہیں ہیں جو حفیظ کی اختراع ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ
قاری کے ذہن کو معنی کے خاردار دشست میں دور تک لے جاتی ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوصف حفیظ کی غزل میں ان کی شاعری کی طرح زبان و
بیان کی غلطیاں عام ہیں۔ اکثر اوقات علامت فاعل نے ان کے یہاں نہیں ملتی، کہیں تذکر
وتانیش میں ٹھوکر لگتی ہے۔ کہیں تعقید اور خلاف محاورہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ حفیظ کی ان
حامیوں کی طرف ملک اسماعیل حسن خان نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
”ان کے یہاں زبان و بیان کی لغزشیں اور کوتا ہیاں کافی ملتی ہیں۔“

جو ادنی تامل کے بعد دریافت کی جا سکتی ہیں۔”^۱

اگر چہ ملک اسماعیل حسن خان حفیظ کے بہت سخت نقاد ہیں مگر آخر میں انہوں نے حفیظ کی شاعری کو ان لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

”.....لیکن پھر بھی ایک قدم تو اٹھایا۔ اردو شاعری کو نغمگی،

شیرینی، رنگینی، موسیقی خیز اور ترم ریز فضاعطا کی۔“^۲

مندرجہ بالا سطور میں حفیظ کی غزل گولی سے متعلق جواباتیں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں ان سے یہ روشن ہوتا ہے کہ وہ اردو کے بلند پایہ غزل گوشاعر تو نہیں مگر اپنے معاصر غزل گویوں میں اس وجہ سے ممتاز ہیں کہ ان کے کلام میں روانی، شلگفتگی، اثر آفرینی، شیرینی اور موسیقی کا ایسا دریا بہتا ہے جس کے قریب دوسرے نہیں پہنچ پاتے۔ حفیظ نے نازک خیالات اور محوسات کو ہلکے ہلکے انداز میں پیش کیا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا ہے کہ بہت بڑی بات بڑی سادہ زبان میں بلا تکلف کہہ دی گئی ہے۔ حفیظ کے کلام کی یہ رعنائی بہتوں کے دلوں کو لبھاتی ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اردو کے ناقدوں نے ان کے کلام پر خاص توجہ نہ کی وہ عوام کے دلوں میں گھر کئے رہے۔ حفیظ کے کلام کی ان خوبیوں کے پیش نظر ڈاکٹر سید عبد اللہ نے ان کو معاصر شعرا میں منفرد گردانا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبد اللہ کے خیالات سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے ان کے الفاظ نقل کرتی ہوں:

”حفیظ ہمارے رومانی شاعروں میں سب سے الگ اس لئے

رہا کہ اس کی رومانیت کا رنگ جدا ہے۔ وہ اختر اشیرانی سے اس لئے الگ ہے کہ وہ ایک ایسی محبوبہ پرفیفتہ رہا ہے جسے حفیظ نے رقصہ کا خطاب دیا ہے۔ حفیظ کی رومانیت بعد کے رومانی شاعر مجاز سے اس لئے الگ ہے

^۱ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خان، جمالتان، دہلی مارچ ۱۹۶۵ صفحہ ۷۱

^۲ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خان، جمالتان، دہلی مارچ ۱۹۶۵ صفحہ ۱۸

کہ حفیظ آداب زندگی کے لحاظ سے اس آوارگی کا کبھی معتقد نہیں ہو سکتا جو
مجاز کا خاص اسلوب حیات ہے۔ وہ میراجی اور ان۔۔۔م۔ راشد اور جوش سے
بھی مختلف ہے اور ہوتا چاہئے۔ اس کی رومانیت تو اس کی اپنی ہی ہے جو
ایک طرف اس کی سرشاری اور جوش زندگی میں اور دوسری طرف اس کے
ملی اور وطنی احساسات میں منعکس ہوئی ہے۔ وہ نغمہ نیگور کی خواب آلود
موسیقی سے بھی مسحور ہے اور اسے اقبال کے لہوں سے بھی خاص دلستگی ہے۔
مگر اقبال کی شاعری کے انداز اور اس کی فکری گہرائی اور وسعت سے حفیظ
کو کچھ زیادہ حصہ نہیں ملا..... اور یہ بہت اچھا ہوا کہ حفیظ نے اقبال سے
اشارہ پا کر پوری بات اپنے ہی انداز میں کی ورنہ آج حفیظ پر مضمون لکھنے کی
کسی کو ضرورت ہی نہ پڑتی اور وہ مخف وغیرہ کی صفت میں شمار ہو کر قلم انداز
ہو جاتے۔“^۱

* * *

۱۔ حفیظ کی شاعری نالہ، پابند از ڈاکٹر سید عبد اللہ، حفیظ نمبر، افکار لاہور، صفحہ ۵۰۳

گیت

میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ حفیظ اگر گیت نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں تو یہ بات باعث نگ کیوں ہے۔ فنکار مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتا ہے اور کسی صنف میں اس کو زیادہ کامیابی ملتی ہے تو لوگ اس صنف کے تعلق سے اس کو یاد کرتے ہیں۔ غالب زندگی بھرا پنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز کرتے رہے مگر سخنوری کا تاج ان کے سر پر اردو نے رکھا۔ ایسی صورت حال میں جس صنف میں کامیابی مل جائے اسی میں اپنے فن کو جلا بخشی کی کوشش کرنی چاہئے۔ شاہ کا رتکیقات اسی طور پر ظہور میں آتی ہیں۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حفیظ سے ہمدردی رکھنے والے ناقدین اور دوسرے لوگ، ان کی شہرت اور عظمت کا سکھ دوسری اصناف میں بٹھانے پر بھڈ ہیں۔ اس لئے جب کوئی ان کو گیت نگار کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کرتا ہے ان کے ناقدین اور ہمدردوں کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ثابت نقطہ نظر نہیں ہے۔ انہوں نے بڑے خوبصورت گیت لکھے ہیں۔ اس کی بیت اور موضوعات میں وسعت پیدا کی ہے۔ اس کے الفاظ، محاورات اور مصطلحات میں ندرت و جدت پیدا کی ہے۔ اس صورت حال میں گیت ان کے لئے باعث افتخار ہے نہ کہ باعث نگ و ندامت جس پر بعض لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ہری چند اختر نے حفیظ کو اردو گیت کا موجود کہا ہے۔ گیت کے موجود تو حفیظ نہیں ہیں اس لئے کہ ان سے ماقبل اردو میں گیت کی روایت ملتی ہے لیکن ان کے گیتوں میں رندگی کی جو رنگ تصویریں ملتی ہیں ان

کے پیش نظر ان کو جدید گیت کا موجہ کرنے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔ حفیظ کے گیتوں کی قدرو قیمت کے متعلق میجر سید ضمیر جعفری کا خیال ہے:

”حفیظ نے اردو شاعری کو پہلی مرتبہ اتنے پیارے اور اتنے بہت سے گیت دے جو اس سے پہلے نہیں لکھے گئے تھے..... ان گیتوں کی منحاس ان کے رس، رچاؤ، بہاؤ اور سجاوے نے یک بارگی ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان کا رسیلا پن سید حادلوں میں اتر گیا۔ ان کی دوڑتی گاتی ہوئی نغمگی بے ساختہ لبوں سے بہہ نکلی۔“^۱

یہ عرض کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ حفیظ سے قبل اردو میں گیت لکھے جا رہے تھے۔ مندرجہ بالا سطور میں اردو گیت کی زنجیروں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس صورت حال میں حفیظ اردو گیت کے موجود تو نہیں ہو سکتے ہاں یہ صنف ان کے ہاتھوں نئے امکانات اور جہات سے روشناس ضروری ہوئی۔ ہری چند اختر کے مطابق انہوں نے اردو شاعری کو بڑے میٹھے اور رسیلے گیت دے ہیں۔ لیکن حفیظ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں بھی گیت کا رس بھر دیا ہے۔ اس لئے بعض اوقات ان کی نظمیں گیت کا پیرا یہ اختیار کر لیتی ہیں اور بعض گیت اپنی طوالت میں نظموں سے آنکھیں چار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ذاکر قیصر جہاں نے سوزِ عشق سے متعلق رقم کیا ہے:

”حفیظ نے عشق کی مختلف کیفیات کی مصوری بھی کی ہے۔ ان کے کلام میں نالہ و بکا خود سپاری نہیں ملتی بلکہ ایک جوش و ولولہ اور عزم و حوصلہ نمایاں ہے۔

پھر اسی اٹھان سے تیر اٹھے کمان سے
صبر کی زبان سے شور الاماء اٹھے

¹ حفیظ۔ ایک نئی آواز از میجر سید ضمیر جعفری، حفیظ نمبر افکار صفحہ ۵۱۵

جاگ انھیں دلوں کے بھاگ
 جاگ سوز عشق جاگ
 ”یہ طمطراق ہستی اور جوش عام طور پر گیت میں جگہ نہیں پاتا۔
 گیت کا مزاج نہایت نازک اور لطیف ہوتا ہے۔ عام طور پر اس میں خود
 سپاری درد و خشکی کو جگہ ملتی ہے۔ حفیظ نے گیت میں بلند آہنگی والولہ اور جوش
 کو بھی خوبصورتی سے نبایا ہے لیکن ان میں وہ درد و تڑپ اور دبادباد کھکم ہے
 جو گیت کی روح ہے۔“

سوز عشق اور اس قبیل کے گیتوں میں حفیظ وہ درد و تڑپ اور دبادباد کھکم کیوں نہیں
 سمو سکے اس امر پر غور فرمائیں تو محسوس ہوگا کہ حفیظ کا عہد سیاسی، معاشرتی اور ذہنی بیداری
 کا عہد ہے۔ فضائیں آزادی، قومیت اور وطنیت کے نعرے گونج رہے تھے۔ لوگ غلامی کی سو
 سال کی زندگی پر ایک لمحہ کی آزادی کو ترجیح دیتے تھے۔ شکر و صبر کا پیالہ چھلک پڑا تھا۔ اس
 لئے اس عہد کے شعروادب پر اس کے اثرات مرتم ہو گئے تھے۔ چنانچہ شاعری کی ہر صنف
 اس سے متاثر ہو رہی تھی۔ ایسی حالت میں گیت اس سے کیوں کر محفوظ رہ سکتے تھے۔ اس لئے
 سوز عشق کا طمطراق ہستی اور جوش عام پر یہ گیت جیسے گیتوں میں بھی ملتے ہیں۔

اپنے من میں پریت بالے اپنے من میں پریت
 بھارت ماتا ہے دکھیاری دکھیارے ہیں سب نزاری
 تو ہی انھالے مندر مرلی تو ہی بن جاشام مراری
 تو جاگے دنیا جاگے جاگ انھیں سب پر یہم پچاری
 بالے اپنے من میں پریت

اس گیت کے موضوع پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ بھارت ماتا کو غلامی کی شکل

میں جو دکھ پہنچ رہا ہے اس کا شدید احساس شاعر کو ہے اس لئے وہ بھارت والے کو مناسب کر کے کہتا ہے کہ اپنے دلوں میں محبت کی شمع فروزاں کرو۔ یہ شمع ایک دوسرے کے دلوں میں روشنی بخشدے۔ آپس کے نفاق کو منادو۔ پھر کرشن کی طرح اس سے دلوں کی تغیر کا کام لو۔ ان باتوں سے یہ روشن ہوتا ہے کہ وقت کے تقاضوں نے حفیظ کو اپنے گیتوں میں ان موضوعات کو سمیئنے پر مجبور کیا ہے جو دراصل گیت کے دائرة اثر سے باہر ہیں۔ موضوعات نے اپنے لئے ایسے آہنگوں کی تلاش کی جو ذاکر قیصر جہاں کے نزدیک طمثاق ہستی اور جوش سے عبارت ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ یہ عصری حیث ہے جو حفیظ کے گیتوں نظموں اور غزلوں میں یکساں طور پر اظہار کے لئے بے تاب نظر آتی ہے۔ ذاکر وزیر آغا نے بھی حفیظ کے گیتوں کے اس وصف کی طرف اشارہ ان لفظوں میں کیا ہے:

”حفیظ جاندھری کے ہال گیت میں بت پرستی کا عمل ایک کشادہ

کندیوس پر پھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور محبت کے جذبے نے محبوب کے سراپا

کے علاوہ دوسری اشیا اور مظاہر کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا ہے۔“

حفیظ نے محنت کشوں اور بچوں کے لئے بھی گیت لکھے ہیں۔ ان گیتوں میں آہنگ اور نغمے کا بہت رچا ہوا شعور ملتا ہے۔ آہنگ کو برقرار رکھنے کے لئے حفیظ کبھی حروف کی تکرار سے کام لیتے ہیں اور کبھی ٹیپ کے مصرع کی تکرار سے۔ مثلاً چکیا گھر گھر کرتی اور فندک فندک فک دھنک دھنک ان ٹیپ کے مصرعون سے چکی کے چلنے اور دھنکی کے دھننے کی آواز نکلتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آوازوں کی اتنی پچی تصویر آج تک کسی نے لفظوں میں نہیں اتنا ری ہے۔

حفیظ کے گیتوں میں ایسے گیت بھی ملتے ہیں جن میں عشق و محبت کی کیفیات بھر پور طور پر ملتی ہیں۔ ان میں درد و ترپ، کمک اور دکھ سب کچھ ہے جس سے گیت عبارت ہے اور جن کی تلاش ذاکر قیصر جہاں ان کے ایسے گیتوں میں کرتے ہیں جو عصری حیث سے لبریز ہیں۔ میرے خیال میں ایسے گیت کرشن بن سری، اندھی جوانی وغیرہ ہیں۔ ان گیتوں کے چند بند کھیں۔

بُسری کی لے نہیں ہے آگ ہے اور کوئی شے نہیں ہے آگ ہے
 پریم کی یہ آگ چار سو لگائے جا
 جائے جا جلائے جا
 کان مرلی والے نند کے لال
 بُسری بجائے جا بُسری بجائے جا
 (کرشن بُسری)

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
 گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
 گھٹائیں کالی کالی
 خوب برستے والی
 متواں، پرشور
 گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

گلشن کی گلپوش ادا میں
 بن میں بول رہے ہیں سور
 گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
 آموں کی خاموش فضائیں
 کویل کی مدھوش صدائیں
 گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

جوانی لے آئی برسات
 جوانی لے آئی برسات

جوانی ہائے جوانی
 نادانی سرشوری
 ستانی
 بد ذات
 جوانی
 لے آئی برسات
 جوانی لے آئی برسات
 بیٹھا ہوں اب دُگر کنارے
 کرتا ہوں حوروں کے نظارے
 آہ نگاہیں آہ اشارے
 چھائی گنگہ پر کالی رات

جوانی لے آئی برسات
 جوانی لے آئی برسات
 محبت آہوں کا طوفان
 محبت آہوں کا طوفان
 محبت پیاری پیاری
 میٹھی سی بیماری
 بے چاری
 انجان
 محبت

آہوں کا طوفان

محبت آہوں کا طوفان

میرا خیال ہے کہ حفیظ کے ایسے ہی گیتوں کے پیش نظر فراق گورکھپوری نے ان کی شاعری کو ابنتی ہوئی اور اٹھلاتی ہوئی جوانی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

”آواز کی یہ تیاری، یہ ابنتی ہوئی اور اٹھلاتی ہوئی جوانی، یہ بے تکلف اور بے لاؤ رچاؤ اور نکھار، یہ شوخ اور چھپلی زنگینی، یہ دھن، یہ رسیلا پن، یہ رنگ، یہ رس، یہ کسک اور یہ انگڑائیاں ہم کو آج تک کسی اور شاعر میں کہیں نہیں ملتی۔“ ۱

سید ضمیر جعفری اور بریگیڈیر گلزار احمد حفیظ کی بعض نظموں کو بھی گیت کہتے ہیں۔ یہ نظمیں ہیں ابھی تو میں جوان ہوں، دل ہے پرانے بس میں اور برسات۔ ان میں دل ہے پرانے بس میں کوسوز و ساز میں گیت کے خانے میں رکھا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس کو گیت کی بیئت دی ہے۔ اگرچہ اس نظم کا انداز بیان دوسری نظموں کو ابھی تو میں جوان ہوں اور برسات کی طرح بیانیہ ہے پھر اس میں پائی جانے والی طوالت بھی اس کی تاثیر میں مانع ہوتی ہے۔ ان نظموں میں داخلی کیفیتوں اور جذبوں کی عکاسی اس طرح ہوتی بھی نہیں ہے جس طرح گیتوں میں ہوتی ہے۔ ان نظموں کے بارے میں ڈاکٹر قیصر جہاں کا خیال ملاحظہ فرمائیں:

”ابھی تو میں جوان ہوں ان کی مشہور نظم ہے جس میں جوانی کے

نشے کی سرشاری کی کیفیت بیان ہوتی ہے۔ گیت کے بنیادی اوصاف یعنی

جد بے کی یک رنگی اور موسمیقت اس میں موجود ہے لیکن اس کے بیانیہ

انداز کی وجہ سے اس کو نظم کہا جائے گا۔ سید ضمیر جعفری اور بریگیڈیر گلزار احمد

اس کو گیت کہنے پر مصر ہیں۔ دل ہے پرانے بس میں اور برسات کو بھی

گیت کے خانے ہی میں جگہ دیتے ہیں۔ ان کی نظم برسات کے بندوں کو

علاحدہ علاحدہ کر کے دیکھا جائے تو بڑی لا جواب تصویر بنتی ہے لیکن طوالت
نے اس کو نظم ہنادیا ہے۔^۱

حفیظ نے گیتوں کی دنیا میں یہ انقلاب برپا کیا کہ ہندی الفاظ و تراکیب سے
پہلو تھی کر کے فارسی آمیز زبان میں بھی گیت لکھے۔ اگرچہ ان گیتوں کی ہیئت نظموں جیسی ہے
مگر ان میں نغمگی، شیرینی اور موسيقی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ لیکن یہ کوشش صرف تجربہ کی حد
تک پسند کی جانے کے لائق ہے۔ کیونکہ گیت کا مزاج ہندی ہے۔ اس لئے اس کو ہندی آمیز
اردو میں لکھنا چاہیے نہ کہ فارسی آمیز اردو میں۔ یہ فکری الفاظ تراکیب اور اصطلاحیں گیت کے
حسن کو محروم کرتی ہیں۔ ان میں سوزش غم اور عورت کے دل کی دھڑکن نہیں ملتی جو ہندی
گیتوں کا طرہ امتیاز ہے۔ فارسی شاعری میں عشق اول درد معموق پیدا می شود مگر اظہار پہلے
عاشق کی طرف سے ہوتا ہے جب کہ ہندی شاعری میں عشق کا اظہار عورت کی طرف سے
ہوتا ہے۔ اس خوبی نے گیتوں میں ایک نئی لذت بھر دی ہے۔ فارسی آمیز اردو میں یہ کیفیت
اور لذت عنقا ہے اس لئے ڈاکٹر قیصر جہاں رقم طراز ہیں:

”حفیظ نے فارسی آمیز زبان میں خوبصورت گیت نما نظمیں لکھی ہیں

جن میں نغمگی اور روانی کی کمی نہیں لیکن میرے خیال میں ان کے وہ گیت
جو انہوں نے خالص اردو میں لکھے ہیں ان کے بہترین گیت ہیں۔^۲

لیکن اس مقام پر یہ بات ذہن نشیں رکھنے کی ہے کہ حفیظ نے جس طرح نظم نگاری
کی دنیا میں نئے نئے تجربات کئے ہیں اسی طرح گیت کے فن میں بھی تجربے کئے ہیں۔
فارسی آمیز اردو میں ان کے جو گیت ہیں وہ اسی خانہ میں رکھے جانے کے لائق ہیں۔ کیونکہ
ان کے گیتوں کا غالب رجحان ہندی ہے نہ کہ فارسی۔ ان کے گیتوں میں کرشن، بانسری،
رادھا اور دوسرے استعارے ملتے ہیں جن کا براہ راست تعلق مقامی سرزی میں سے ہے۔ حفیظ

۱ اردو گیت از ڈاکٹر قیصر جہاں صفحہ ۱۲۵

۲ اردو گیت از ڈاکٹر قیصر جہاں صفحہ ۱۲۷

کے گیتوں اور نظموں کی منظر نگاری پر غور کریں تو بھی ان میں ہندوستان کی فضا، موسم اور ماہول سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ حفیظ کی یہ خصوصیت ان کو دوسرے ہم عصر شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ البتہ نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظموں میں مقامی رنگ کو کامیابی سے پیش کیا ہے مگر ایک عرصہ دراز تک ان کو مستند نہیں سمجھا جاتا رہا۔ اس کے برعکس حفیظ نے اپنے آغاز شاعری سے لوگوں کے دل میں گھر کر لیا۔ حفیظ کی شاعری اور گیت میں ملنے والی اس خصوصیت کے پیش نظر فراق گورکھپوری نے کہا ہے:

”لیکن اپنے گیتوں اور ترانوں میں تو حفیظ جالندھری پنجاب اور مغربی اور مشرقی یوپی کے کئی شعرا سے ممتاز اور ممتاز ہیں اس لئے کہ دوسرے شعرا نے گیت لکھنے کی بالا رادہ کوشش کی ہے وہ گیت کی روح میں ڈوب نہیں سکے۔ وہ ہندی گیت کی سادگی میں ہندی گیت کا ٹھوس پن نہیں لاسکے اس سے ان کے گیت پھیپھے، پھیکے، ہلکے اور کمزور ہیں۔ اس کے برعکس حفیظ جالندھری کے گیتوں اور ترانوں کے مصرع اور نکڑے بھر پور اور بامعنی ہوتے ہیں۔ رومانی منظر اور ہر طرح کے گیتوں میں حفیظ جالندھری نے سہل ممتنع کی بے لائگ مثالیں دی ہیں۔“^۱

فراق گورکھپوری کی اس رائے کے پیش نظر میں یہ سمجھتی ہوں کہ حفیظ نے فارسی آمیز اردو میں جو گیت لکھے ہیں ان کی حیثیت تجربے سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسے گیتوں کو حفیظ کا اصل رنگ قرار دینا ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ اس لئے ڈاکٹر قیصر جہاں کی اس رائے سے اتفاق کرتی ہوں:

”فارسی آمیز زبان میں گیت لکھنے کے جو تجربے حفیظ نے کئے ہیں وہ اپنی جگہ قابل تحسین ہیں لیکن حفیظ کے یہ تجربات زیادہ دور تک

^۱ حفیظ جالندھری، ریڈیائی تقریر از فراق گورکھپوری نشریہ آل انڈیا ریڈی یو لائبریری ۱۹۳۷ء

ہمارا ساتھ نہیں دے سکیں گے کیونکہ یہ وہ دور ہے جب ہر صنف پر دیکی رنگ کی چھاپ کو قابل قدر سمجھا جا رہا ہے۔ انداز بیان، لجہ اور زبان سب پر ہندوستانیت کا رنگ غالب ہے۔ ایسے دور میں جب کہ غزل بھی جس کا مزاج خالص ایرانی ہے گیت کی زبان کو اپنا رہی ہے وہاں گیت میں غزل کا لجہ اور قصیدے کی بلند آنگلی کس طرح قابل قبول ہو سکتی ہے۔^۱

اس طرح بحثیت مجموعی حفیظ کے گیتوں کا محاسبہ کیجئے تو محسوس ہو گا کہ یہ صنف حفیظ کے ہاتھوں یک ایک نئے حیات سے آشنا ہوئی۔ اس کی بینت میں انہوں نے کشادگی پیدا کی اور موضوعات میں وسعت۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گیت غزل کی طرح مختلف سیاسی، سماجی، ثقافتی موضوعات سے ہم کنار ہوا وراس کی زبان اور طرز ادا میں فرق آیا۔ اب تک گیت ہندی زبان و محسوسات سے قریب سمجھا جاتا تھا اب یہ معلوم ہوا کہ اس پر فارسی الفاظ و تراکیب کے دربعی وا ہو گئے۔ اگرچہ اپنے مزاج اور ماحول کی وجہ سے گیت ہندی روایت سے ہی قریب ہے مگر فارسی آمیز اردو میں ایک روایت تو بنی۔ اب تک اس صنف کے نشان قدم اس زبان میں نہیں ملتے تھے مگر اب حفیظ کے ہاتھوں اس کے لئے یہ میدان بھی پامال ہوا۔

حفیظ کے وہ گیت بھی خصوصی توجہ کے مستحق ہیں جو بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں اور جن میں کام کرنے کی نگری پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح چکی چلنے کی آواز اور دھنکی کی دھنک کی آواز اردو میں اس طرح مجسم ہوئی ہے کہ ان پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

ان باتوں کے علاوہ وہ فطری موسیقی اور نگری جو حفیظ کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے ان گیتوں میں آبشار بن کر نغمے الا پتا ہے۔ اس معاملے میں اردو کا کوئی شاعر حفیظ کا مقابل نہیں۔ اختر شیرانی بھی نہیں۔ حفیظ کے گیتوں کی یہی خصوصیات ان کو اردو گیت کی دنیا میں ایک لا فانی آواز بناتی ہیں۔ ان کو حیات جادو ای بخششی ہیں۔ ان کے معتبر صیں سے خراج

تحسین وصول کرتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو گیت حفیظ کے ہاتھوں یا کیک بالغ ہو جاتا ہے۔ اس کا جوش و امنگ مچلتا ہے، اس میں الہڑ جوانی کی متانہ روی ملتی ہے، اس میں ہندوستان کا رنگ پایا جاتا ہے، اس میں ہجرو وصال کے قصے ہیں، اس میں فراق کے پرسوز نغمے ہیں، اس میں تجربات و مشاہدہ کا رس ہے اور اس میں حب وطن اور جان شاری کے جذبے ہیں، اس میں عشق و محبت کی داستان پارینہ ہے۔ غرض بہت سے موضوعات اور کیفیات جب شیر و شکر ہوتے ہیں تو گیت کی شکل میں ڈھل کر حفیظ کے لبوں سے نکلے ہیں۔ انہی باتوں کے پیش نظر ڈاکٹر قیصر جہاں نے حفیظ کے گیتوں کو اس انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

”حفیظ سے قبل بھی گیت لکھے گئے ہیں لیکن حفیظ نے گیت کے کیونس کو بہت وسیع کر دیا۔ انہوں نے ہر قسم کے مضامین گیت میں سوئے ہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے۔ ان کے گیت مخفی ہجرو وصال کے افسانوں کے گرد نہیں گھومتے بلکہ دوسرے مسائل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ فارسی آمیز زبان میں بھی گیت لکھے جاسکتے ہیں۔“ ۱

ڈاکٹر وزیر آغا نے حفیظ کی خدمات کو ان لفظوں میں سراہا ہے:

”محبت اور بت پرستی کے عمل میں اس کشادہ انداز نظر کی نمو حفیظ کے گیت کا ایک امتیازی وصف ہے تاہم غور طلب بات یہ ہے کہ حفیظ نے موضوع میں کشادگی تو پیدا کی ہے مگر گیت کے اصل مزاج کو مجرور نہیں کیا۔ گیت کے سلسلے میں حفیظ کی یہ عطا بڑی خیال انگیز ہے۔“ ۲

* * *

۱ اردو گیت از ڈاکٹر قیصر جہاں صفحہ ۱۲۹

۲ اردو شاعری کا مزاج از ڈاکٹر وزیر آغا، صفحہ ۲۲۳

شاعرانہ عظمت

حفیظ جالندھری ۱۳ جنوری ۱۹۰۰ میں پیدا ہوئے اور بقول خود سات برس کی عمر میں شعر موزوں کرنے لگے تھے۔ صحبا لکھنؤی، مدیر افکار، لاہور نے اس عمر کا ایک شعر نقل کیا ہے۔

محمد کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

اس امر سے قطع نظر کہ فنی معیار سے اس شعر کی کیا قدر و قیمت ہے اپنے میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ سات برس کی عمر میں شعر موزوں کرنے کا فن حفیظ کو قسام ازل نے بخشا تھا۔ اس سے شعرو شاعری سے ان کے فطری رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ حفیظ جالندھری کا انتقال ۲۱ دسمبر ۸۲ کی شب میں لاہور میں ہوا۔ اس طرح ان کی شعرو شاعری کا عہد ۵۷ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ حفیظ جالندھری مرحوم نے اپنے انتقال سے پہلے ایک غزل کبھی تھی جس کو ان کے عزیز دوست پروفیسر مرزا سوز نے نقل کیا تھا اور جو بیسویں صدی فروری ۱۹۸۳ میں شائع ہوئی ہے اس غزل کا ایک شعر ہے۔

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم پر ہی چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے مری سزا کا حساب کر دے

پہلے شعر اور آخری غزل کے اس آخری شعر کے درمیان ۵۷ برسوں کا عرصہ پھیلا ہوا ہے۔ کم ہی فنکاروں کو فکر و فن کے موتی روکنے کے لئے اتنا طویل عرصہ ملا ہے اس طرح

قامت ازل نے واقعی ان پر کرم خاص کیا تھا اور اس کے پیش نظر خداوند کریم کے کرم کے معاملوں پر اس کے سپرد کرنا بہت معقول بات ہے لیکن خطاؤں کا شمار اور اس کا حساب ہم جیسے قاری کیلئے کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے۔ خداوند کریم کیلئے تو اس کے اصول و آداب مقرر ہیں اور وہ شمار ہو کر سزا و جزا کی میزان پر پر کھے جائیں گے مگر ہم ان کے شمار کے لئے کون سی میزان مقرر کریں، کن اصول و آداب پر پر کھیں کیا معیار مقرر کریں، یہ سوال اپنے اندر بڑی پیچیدگی اور نزاکت رکھتا ہے۔

۱۹۰۷ء میں جب حفیظ نے پہلا شعر بارگاہ رسالت میں پیش کیا، تب سے تو نہیں مگر ۱۹۱۱ء سے جب انہوں نے ایک مشاعرے میں اپنی پہلی غزل سنائی جس کا مطلع ہے۔

خواب میں دلدار کی تصویر ہم نے دیکھ لی
رات کو جاگی ہوئی تقدیر ہم نے دیکھ لی

تب سے ان کی شاعری برابر نقد و نظر کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ بعضوں کے نزدیک ان کی شاعری میں وہ سب کچھ ہے جن سے فکاری عبارت ہے اور بعضوں کے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو لاائق اعتماد ہو۔ میرے خیال میں اردو شاعری میں اتنی تنازعہ فیہ شخصیت کسی کی نہیں ہے۔ اس مقالے کے گزشتہ صفحات میں اس امر پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اگر الگ صنفوں کے تحت حفیظ کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ مندرجہ ذیل میں چند مشاہیر ناقدین، صائب الرائے اور اہل نظر کی رائیں درج کروں تاکہ حفیظ کی شاعری سے متعلق متفاہد آراء کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ پروفیسر احتشام حسین کی رائے ہے:

”حفیظ نے اس جادو بھری سرز میں میں شاعری کا رس پیا، نغمہ
سرانی کی، جھوٹے اور اپنی آواز دے دوسروں کو مست کرنے لگے... انہوں
نے اردو شاعری کو تازگی بخشی، از سرنوایسے قلبی واردات اور جوان جذبات
سے آشنا۔ کیا یہ ایسی باتیں ہیں جن کو اردو شاعری کا مداح یا نقائد نظر انداز نہ“

کر سکے گا..... میں ایسے لوگوں کو
 جانتا ہوں جو انہیں صرف شاہنامہ اسلام کا شاعر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی
 ملتے ہیں جنہیں حفیظ کا نام صرف ایسی نظموں کے ساتھ یاد ہے جیسے اپنے
 من میں پریت بسائے، رقصہ اور ابھی تو میں جوان ہوں۔ کچھ ان کے
 طرز شعر خوانی کو ان کا سب سے بڑا کمال قرار دیتے ہیں، کچھ ان کی
 غزلوں میں جذبات کی عمومیت اور اظہار کی برجستگی پر فرمایتے ہیں۔ میں
 سوچتا ہوں کہ اور کچھ نہیں اگر صرف ان تمام پسندیدگیوں ہی کو جمع کر دیا
 جائے تو کیا ایک بلند پایہ شاعر کی بہت سی خوبیاں سمجھانہیں ہو جاتیں۔^۱

پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں:

”دور حاضر کے جن شعراء نے شاعری کو چمکایا اور عوام کے مذاق کو
 متاثر کیا ہے ان میں سے ایک حفیظ بھی ہیں۔ ان کی بلکلی پھلکی عشقیہ اور
 رومانی نظمیں نوجوانوں میں بالخصوص بہت مقبول ہیں۔ پڑھنے کا انداز مسحور
 کن ہے۔ جگر کی طرح آواز نہایت دلکش پائی ہے۔ مشاعرہ لوث لینے کا
 خاص ملکہ ہے۔

حفیظ کی غزلیں اچھی نہیں ہیں، نظمیں البتہ اچھی کہتے ہیں۔ شاہنامہ
 اسلام کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے اور اس کی بدولت حفیظ کو جو
 عزت اور شہرت ملی ہے اس کا اندازہ کرنا محال ہے۔ ایک دور تھا جب کہ یہ
 شاہنامہ پڑھتے پھرتے تھے اور ہندوستان کے چپے چپے میں اس کی دھوم تھی۔
 حفیظ نے ہلکے ہلکے گیت بھی لکھے ہیں۔ ان میں کوئی گہرائی نہیں
 ہے لیکن عوام کے مذاق کو پسند آتے ہیں حفیظ نے اردو نظم

^۱ حفیظ نمبر افکار، لاہور ”نذرانے“

کے اسالیب کو وسعت دینے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ وہ نظم کی نئی نئی شکل پیدا کرنے کے استاد ہیں۔ ان میں بعض شکلیں دلاوریز ہوتی ہیں۔“^۱

فرق گورکھپوری نے فرمایا:

”حفیظ کی شاعری نے جن خوبیوں کی وجہ سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ان میں سب سے نمایاں خوبی ان کی نظموں کا نگیت یا ترنم تھا۔ یہ چیز اکبر، چکبست، اقبال اور جوش ملیح آبادی یا حفیظ سے پہلے کسی شاعر کے یہاں اس رنگ اور اس شکل میں ہمیں نہیں ملی۔ موسیقی اور شاعری، گیت اور نظم، ترانہ اور ادب کا ایسا میل پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ اگرچہ حفیظ کے بعد کچھ لوگوں نے گیت اور نظم، نگیت اور شاعری کو ایک کرتا چاہا اور ایک حد تک وہ لوگ کامیاب ہوئے لیکن وہ حلاوت، وہ سریلا پن دوسرے لوگ پیدا نہیں کر سکے۔ نغمہ زار اور سوز و ساز میں حفیظ کے اس قسم کے کارنا مے ہیں۔“^۲

وزیر آغا حفیظ کے گیتوں سے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں:

”آخر شیرانی کے مقابلے میں حفیظ جالندھری کے ہاں گیت کو ایک وسیع تر کینوس پر پھیلانے کا کام بھی ملتا ہے۔ یعنی اگرچہ حفیظ نے ایسے گیت بھی لکھے ہیں جن میں محبت کا ارضی پہلو اجاگر ہوا اور محبوب کا جسمانی وجود نگاہ کا مرکز بناتا ہم اس کے ہاں گیت کی محبت کو ایک کشادہ مفہوم عطا کرنے کی روشنی بھی ابھری ہے۔“^۳

۱۔ بحوالہ حفیظ کی شاعری از ملک اسماعیل حسن خاں، جمالستان دہلی، مارچ ۱۹۶۵، صفحہ ۱۸

۲۔ حفیظ جالندھری از فرق گورکھپوری ریڈ یائی تقریر نشریہ آل انڈیا ریڈ یوکھنو ۱۹۷۱ اگست

۳۔ اردو شاعری کا مزاج از ڈاکٹر وزیر آغا، صفحہ ۲۲۱

نظیر صدیقی نے حفیظ کی غزل نگاری سے متعلق یہ رائے دی:

”بیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہونے والے اردو شاعروں میں حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی بہت ہی مشہور، اہم اور مقبول نام رہے ہیں۔ اگرچہ دونوں کی اہمیت اور مقبولیت کا تعلق نظم نگاری سے ہے لیکن دونوں نے کثیر تعداد میں غزلیں بھی کی ہیں۔ اگرچہ دونوں کی غزلوں کے دو ایک شعر بہت مشہور ہیں اور ان اشعار میں غیر فانی ہونے کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں نہ جان ہے نہ انفرادیت۔“^۱

عبد القادر سروری کی رائے ہے:

”موجودہ دور کے شعرا میں پنجاب کے شاعر حفیظ ہیں جو مشہور استاد غلام قادر گرامی کے شاگرد رشید ہیں۔ انہیں کی صحبتوں میں اور انہیں کی رہنمائی میں حفیظ نے غزل سرائی سمجھی اور شعری صنعت گری پر عبور حاصل کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اقبال سے عقیدت کی وجہ سے اقبال کی طرز فکر سے بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ اس کی بعض نظموں اور غزلوں میں اقبال کا انداز صاف نمایاں ہے۔“^۲

ڈاکٹر سید عبد اللہ رقم طراز ہیں:

”ہمیں حفیظ کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کہ ان کی شاعری محض نالہ دل ہے نغمہ در باب نہیں۔ وہ شاعری ہی کیا جس کی شاعری میں نالہ دل اور نغمہ در باب مل جل کر سامنے نہ آئیں۔ شاعری تو ایک لحاظ سے ہے ہی موسیقی

۱۔ چدید غزل پاکستان اور ہندوستان میں از نظیر صدیقی، فنون جنوری ۱۹۶۹ صفحہ ۱۶۳

۲۔ چدید اردو شاعری از عبد القادر سروری، صفحہ ۲۳۹

اور موسیقی بھی اس نوع کی کہ اس کو کان کے علاوہ دل بھی سن سکتا ہے۔ شعر کی ایک داخلی موسیقی بھی ہوتی ہے جس کو گائے بغیر بھی گایا جاسکتا ہے اور سنایا جاسکتا ہے اور اگر شاعری کبھی اپنی اندر ورنی موسیقی کے علاوہ نغمہ و رباب کی بھی ہم قدم بن جائے تو اسے عیوب نہ کہنے کیونکہ یہ تو وہ ہنر ہے جو شعر کو دو آتشہ بنادیتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ حفیظ کی شاعری نالہ دل بھی ہے اور نغمہ و رباب بھی۔ اور ان دونوں چیزوں کے علاوہ ان میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں غبارے اور کھلونے بھی ہیں جو فضا میں اڑتے نظر آتے ہیں۔ اس کی شاعری کے یہ ٹھانٹھ بھی ہیں کہ فلک شامیانہ ہے اور پربت قناتیں اور اسی ٹھانٹھ کے ہمراہ اس کے یہاں تھی دستی و پستی و خستہ حالی بھی ہے یعنی وہ خارز اروں کی دنیا جو بگلوں سے معمور اور پھولوں سے خالی ہے اور معلوم نہیں کتنی اور دنیا کیں جو شاعر کے تخیل میں ہیں جن سے وہ اپنی شاعری کی کائنات آباد کرنا چاہتا ہے۔^۱

پھول مala کے دیباچہ میں عبد الجید سالک نے بچوں کی نظموں سے متعلق یہ رائے دی:

”حفیظ کی شاعری نے اپنی ندرت، سلامت اور پاکیزگی کی وجہ سے نہایت تھوڑی مدت میں اہل ملک کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ہے۔ عظیم الشان مشاعرے اس کے کلام کی رونق سے آباد ہیں۔ ملک کے متعدد اخبار اور رسائلے اس کے دلا دیز اشعار کو قدر و عزت کی جگہ دیتے ہیں۔ بچے اس کی نظمیں پڑھ کر ہنستے اور قلقاری مارتے ہیں۔ نوجوان سر دھنتے اور جھوٹتے ہیں۔ بدھے اپنا سفید سر ہلا کر اس کی ہونہاری پہ یہ

¹ حفیظ کی شاعری نالہ پابند لے از ڈاکٹر سید عبداللہ حفیظ نمبر، افکار لاہور، صفحہ ۲۹۸

کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ابھی فتنہ ہیں کسی دن کو قیامت ہونگے۔
میرے نزدیک زبان کی سادگی، مطالب کی سلاست اور ادبی اناڈے کے
اعتبار سے حفیظ کی ان نظموں کا پایہ بہت بلند ہے جو بچوں کے لئے لکھی
گئی ہیں۔^۱

شاہنامہ اسلام سے متعلق عبدالقادر سروری کی رائے ہے:

”یہ نظم اردو شاعری کی تاریخ میں اس لحاظ سے ایک اہم چیز ہے
کہ قدیم مشنویوں کو چھوڑ کر اردو میں کسی معین مقصد کے تحت مربوط مسدس
مدو جزر انیس کی طرح کا کارنامہ نہ صحیح مگر اک قومی مرثیہ ضرور ہے۔ اس
میں مربوط خیال موجود ہے لیکن واقعات کے ارتقا کی گنجائش نہیں لیکن
شاہنامہ میں اس کی بڑی عمدہ گنجائش ہے۔ یہی امتیاز شاہنامہ کی اہمیت کا
باعث ہے۔^۲

ملک احمد عیل حسن نے حفیظ کی شاعری کا تجزیہ و تشریح کر کے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے:
”حفیظ نہ بڑے شاعر ہیں اور نہ بلند پایہ، ان کو ہم عظمت کے
قریب بھی نہیں کہہ سکتے“ وہ اردو کے خوش گوش اسکے میں، انہوں نے گیتوں
کو روایج دیا اور اس میں موسیقی کی لہریں شامل کیں، اپنی سریلی رسیلی آواز
سے بہت سے مشاعروں کو لوٹا اور بہتوں کو مسحور کیا، بہتوں کو خوش کیا،
نصف صدی سے زائد شاعری کی، اسلام کی منظوم تاریخ لکھی، یہ دوسری
بات ہے کہ وہ شعریت کے درجے پر پوری نہیں اترتی وہ محض منظوم کلام بن
کر رہ گی ہے لیکن پھر بھی ایک قدم تو اٹھایا۔ اردو شاعری کو نغمگی، شیرینی،

۱. دیباچہ پھول مala از حفیظ جالندھری

۲. جدید اردو شاعری از عبدالقادر سروری، صفحہ ۳۲۱

رنگیں، موسیقی خیز اور ترموم ریز فضا عطا کی۔ نظم کے بعض اسالیب کو وسعت
دی لیکن نیا اسلوب پیدا نہیں کیا۔^۱

یہ ہیں بعض مشاہیر ناقدین، صائب الرائے اور اہل علم کے خیالات جو حفیظ کی
شاعری کی ترسیل و تغییب میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ اندازہ کرنا مشکل
نہیں ہے کہ اکثر لوگوں نے حفیظ کی شاعری کے بعض رنگوں کو پسندید یعنی کی نظر سے دیکھا
ہے۔ اگر ان کو ایک ساتھ ملا دیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ حفیظ کی غزل، نظم، گیت، شاہنامہ
اسلام، بچوں کی نظمیں سب اپنے اندر کچھ نہ کچھ جاذبیت رکھتی ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف
متوجہ کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بذات خود قابل غور ہے کہ حفیظ کی شاعری نے بہت
سے ناقدوں اور صاحب علم حضرات کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس صورت حال میں ان کی
عظمت سے انکار کرنا بڑا بے معنی ہے۔ ملک محمد اسماعیل حسن خاں حفیظ کی شاعری میں ایسے
عناصر پاتے ہیں جنہوں نے نظم کے بعض اسالیب کو وسعت دی اور ایسے گیت کو روایج دیا
جس نے بہت سے مشاعروں کو لوٹا اور بہتوں کو مسحور کیا اور بہتوں کو خوش کیا۔ پھر بھی ان کی
شاعری اسماعیل حسن خاں صاحب موصوف کے بلند پایہ نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ایک طرح کا
تعصب ہے جو حفیظ کی شاعری سے لوگوں نے برتا ہے۔ انہی وجہ سے حفیظ جالندھری نے
اپنے مجموعہ کلام تلخاہ شیریں میں اپنے تلخ گھونٹ پینے کی داستان بیان کی ہے:

”موجودہ صدی اور میں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کوئی اور ہوتا
تو اسی ایک بنا پر شاعری سے بھی بلند کوئی اور دعویٰ کر دیتا۔ یہ میرا احسان
ہے کہ میں شاعر ہونے کا بھی دلبی زبان سے ذکر کرتا ہوں۔“

دلبی زبان سے اس لئے نہیں کہ مجھے اپنے ہم عصروں کی چھری،
کھاڑی اور دریڈہ دہنی سے بقدر انکسار نکلنے کی تمنا یا توقع ہے۔ نہیں، یہ

^۱ حفیظ کی شاعری ملک اسماعیل حسن خاں، جمالستان دہلی مارچ ۱۹۶۵، صفحہ ۱۸

باز و میرے دیکھے بھالے ہیں۔ جو کچھ یہ کہہ سکتے تھے کر سکتے تھے۔ کہہ چکے
کر چکے۔ اس سے زیادہ کی توقع ان کی ہمت و توفیق پر سوداً نہ ہوگا الایہ کہ
وہی آمودتہ پھر دہرا دیں جس کی گردان ہر خادم زبان اور ہر صاحب قلم
کے بارے میں ان کے زبان و قلم سے ہوتی رہی ہے..... مجھے ایسی
خلق کی بھیز بھاڑ میں سے بھی راہ نکلنی پڑی ہے جس کا شوراب بھی دبوچ
لینے تکابوٹی کرڈا لئے اور کھا جانے سے آگے نہیں بڑھا۔ باغِ ادب ان کی
شکارگاہ ہے، مجھے ان کے اکے دکے سے بھی دو چار ہونا پڑا نولیاں بھی مجھے
پر لپکیں جچیں۔“ ۱

حفیظ جالندھری نے اپنے کو کسی جماعت سے کبھی مسلک نہیں کیا بلکہ آزادانہ طور
پر شعروادب کی خدمت کرتے رہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں مختلف رنگوں کا امترانج ملتا
ہے۔ کبھی ان کی شاعری محنت کشوں اور مزدوروں کی حمایت کرتی ہے، کبھی اس میں زرگروں
اور دولتمندوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا سب سے
 واضح ثبوت یہ ہے کہ نظم رقصہ پڑھنے کے جرم میں ان کو گرفتار کیا گیا۔ میں نے گزشتہ اوراق
میں لکھا ہے کہ رقصہ نظم اپنے موضوع کے لحاظ سے اشتراکیوں کے موافق ہے۔ اس لئے
بعض اشتراکی ناقدوں نے اس کو پسند فرمایا۔ حالانکہ اس نظم میں اشتراکی نقطۂ نظر نہیں پیش کیا
گیا ہے بلکہ حفیظ کا وہی رنگ نمایاں ہوا ہے جس نے ان کو شاہنامہ اسلام لکھنے پر مجبور کیا۔
حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نظام معاش اور اشتراکی نظام معاش میں کہیں کہیں بڑی یکسانیت
ملتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ دولت کی تقسیم اسلام میں جس فطری انداز میں ہوئی ہے اشتراکیت
میں اس کا عشر عشر بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں بھی بعض نکات ایسے
ملتے ہیں جب ان پر اشتراکی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ورنہ اپنے آپ میں نہ تو اقبال اشتراکی

ہیں اور نہ حفیظ۔ ان کا نقطہ نظر خالص اسلامی ہے۔ حیات و کائنات کے مسائل پر ان کی نگاہ ایک مسلمان کی حیثیت میں پڑتی ہے۔ زندگی میں جو تضادات اس نقطہ نظر کی روشنی میں ان کو ملتے ہیں ان کا پرده فاش کرتے ہیں۔ اس نقطہ نگاہ کو سامنے رکھئے تو نظم رقصہ کے مندرجہ ذیل اشعار کے معنی واضح ہوتے ہیں۔

مردوں میں غیرت ہی نہیں قومی حمیت ہی نہیں
وہ ملت بیضا کہ تھی سارے جہاں کی روشنی

.....

شان ججازی اب کہاں وہ ترک تازی اب کہاں
اب غزنوی ہمت گئی اب بابری شوکت گئی
اردو نظم نگاری کی دنیا میں حفیظ نے یہ خدمت انجام دی کہ اس میں موسیقی اور
شیرینی کے عناصر ملا دئے۔ اس لئے ان کی نظمیں اگرچہ فکری اعتبار سے بہت اہم نہیں ہیں
لیکن موسیقی اور شیرینی کے لحاظ سے یہاں روزگار ہیں۔ ان کی بعض منظری نظمیں بھی خاصے
کی چیزیں ہیں۔ اس اعتبار سے حفیظ نے نظم نگاری کی بیئت میں بعض ایسے تجربے کئے ہیں
جو ان کو زندگی بخشئے کے لئے کافی ہیں۔ ان کی ایک نظم فرصت کی تلاش کا ذکر یہاں ضروری
ہے۔ یہ نظم دراصل شاعر کی بے پناہ مصروفیتوں کو پیش کرتی ہے۔ لیکن فرصت کی تلاش میں جو
ردعمل شاعر کا ہے وہ تمام بُنی نوع انسان کا ہے۔ آج کی مادی دنیا میں ہر شخص تگ و تاز کر رہا
ہے اور فرصت کے لمحات کی تلاش کر رہا ہے۔ اس نظم میں بعض ایسی تشبیہیں بھی ملتی ہیں جو
اپنے اندر ملنے والی ندرت اور نزاکت کے لحاظ سے عدیم المثال ہیں۔ ان تشبیہوں نے
اس نظم کے مرکزی خیال کی تلاش کو غیر مرئی کے دائرہ سے نکال کر مرئی دائرہ میں داخل
کر دیا ہے۔

یوں وقت گزرتا ہے فرصت کی تمنا میں

جس طرح کوئی پتا
 بہتا ہوا دریا میں
 ساحل کے قریب آکر
 چاہے کہ شہر جاؤں
 اور سیر ذرا کرلوں اس عکس شجر کا
 جو دامن دریا پر زیباش دریا ہے
 یا باد کا وہ جھونکا
 جو وقف روانی ہے
 اک باغ کے گوشے میں
 چاہے کہ یہاں دم لوں
 دامن کو ذرا بھر لوں
 اس پھول کی خوبی سے جس کو ابھی کھلنا ہے
 فرصت کی تمنا میں یوں وقت گزرتا ہے
 یہ عرض کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ بتتے ہوئے دریا میں کسی پتے کی یہ خواہش
 کہ ذرا ایک دم آرام کرلوں اور مناظر قدرت سے لطف انداز ہولوں کبھی شرمندہ تعبیر نہیں
 ہو سکتی۔ اسی طرح اس کا رزار حیات میں کسی موز پر رک کر مناظر فطرت سے لطف انداز
 ہونے کی انسانی خواہش بے سود ہے۔ زندگی خود ایک دریا ہے اور انسان اس میں بتتے ہوئے
 پتے کی حیثیت رکھتا ہے۔ موج حوادث اس کو جدھر چاہتے ہیں بھائے لئے جاتے ہیں۔ اس
 کے بس میں کب کوئی لمحہ ہے۔
 سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
 نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یا بیدل کے لفظوں میں زندگی کو دیکھئے۔

زندگی درگر دنم افتاد بیدل چارہ نیست شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن
 بچوں کے لئے جو نظمیں حفیظ نے لکھی ہیں وہ اردو میں اضافے کی حیثیت رکھتی
 ہیں۔ عظمت اللہ خاں اور اسماعیل میرٹھی وغیرہ نے اس قسم کی کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ لیکن
 ابھی بھی ان نظموں کی اردو میں کمی محسوس ہوتی ہے۔ حفیظ کی نظمیں البتہ بینارہ نور کی طرح
 روشن ہیں۔ ان نظموں میں بیانیہ شاعری کا دریا بہتا ہے۔ حفیظ کا مجموعہ ہندوستان ہمارا سادہ
 اور صاف زبان میں مہماں بھارت کی کथا سے لے کر راجہ رنجیت سنگھ تک ہندوستان کی مسلسل
 تاریخ ہے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف بادشاہوں، راجوں، نوابوں اور رئیسوں کا ذکر و
 بیان دلنشیں انداز میں ملتا ہے۔ ان نظموں میں ہندوستان کی روح تڑپتی ہوئی محسوس ہوتی
 ہے۔ قومی یک جہتی، میل محبت اور اتحاد و اتفاق کا درس بھی ان میں ملتا ہے۔ اس مجموعہ کی
 آخری نظم سے ایک بند ملاحظہ ہو۔

عیسائی پاری سکھ ہندو ہو یا مسلمان نیکی ہے دھرم سب کا نیکی ہے سب کا ایماں
 سب سے کرو بھائی مذہب کا ہے یہ فرمان حاصل ہیں آج تم کو ہر اک طرح کے سامان
 یہ فائدے اٹھاؤ
 بھارت کے نونہالو
 ہندوستان والو

جس طرح مندرجہ بالا بند میں تمام مذاہب میں نیکی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے
 اسی طرح اخلاق مذہب، تاریخ اور تہذیب کے بے شمار گوشے دوسری نظموں میں روشن ہوتے
 ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حفیظ بچوں کی نفیات سے واقف تھے۔
 انہوں نے ان نظموں کی تعمیر و تشكیل میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اخلاق، مذہب،
 تاریخ اور تہذیب سے متعلق چھوٹی چھوٹی اور گہری باتیں آسان، سادہ اور دلکش انداز میں

بچوں کے ذہن نشیں کر دیں۔ ان نظموں کے متعلق جو خیالات عبدالجید سالک نے ظاہر کئے ہیں وہ بہت ہی مناسب اور صائب ہیں:

”حقیقت یہ ہے کہ اصناف شعر میں عملی حیثیت سے بچوں کی
نظمیں لکھنا بے انہما مشکل کام ہے۔ لیکن نہایت تعجب کا مقام ہے کہ حفیظ کا
معصوم تخیل اس دشوار گزار رستے کو نہایت آسانی اور سہولت سے طے کر گیا
اور جس جگہ بڑے بڑے استادوں کا زہرہ آب ہوتا تھا وہاں حفیظ کا قلم ہنتا
کھلتا اور اچھلتا کو دتا چلا جاتا ہے۔“^۱

جبکہ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے پچھلے سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ اس میدان میں
بھی حفیظ نے اپنی انفرادیت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ اگرچہ حفیظ نے روایتی غزل گوئی سے
اپنا سر رشتہ نہیں توڑا ہے مگر اپنی وسیع النظری اور ذہنی بلندی سے اس میں چار چاند لگائے
ہیں۔ ان کی غزلوں میں ڈرامائی عنصر کی کار فرمائی ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے غزل گویوں
سے ان کو ممیز کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سہل ممتنع کی جو بہترین مثالیں ان کی شاعری میں
ملتی ہیں دوسرے کے یہاں نہیں ملتیں۔ غزل نگاری کے ضمن میں یہ خصوصیتیں کم اہمیت نہیں
رکھتیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی معیاری غزلوں کا انتخاب شائع کیا جائے تب
جا کر میری بات پا یہ ثبوت کو پہنچے، یہاں بس چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دیکھا جو میں نے مڑکے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

بجز سے اور بڑھ گئی برہمی مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آسکے

ہائے کس درد سے کی ضبط کی تلقین مجھے
ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

پری رخوں کی زبان سے کلام سن کے مرا
بہت سے لوگ مری شکل دیکھنے آئے

نگاہ و دل کی یک رنگی تھی درکار
وہ سمجھے جام و مینا چاہتا ہوں

نہ توڑو دوستو رشتہ وفا کا
میں دل کے زخم مینا چاہتا ہوں

کوئی بھی اب تو بھرتا نہیں معیار نظر
آدمی شان خدا ہے تو خدا کیا ہوگا

حاصل عشق ہے رسوانی ہی ناکامی بھی
حاصل عمر تو نہ جانے ابھی کیا ہوگا

اپنی موت سے چند ساعت قبل حفیظ نے ایک غزل کہی جس کو ان کے عزیز دوست منور رضوی نے قلم بند کیا ہے۔ یہ غزل روایتی غزل گوئی میں شان امتیاز رکھتی ہے
”ملاحظہ ہو۔“

وہ سرخوشی دے کے زندگی کو ثباب سے بہرہ یاب کر دے
میرے خیالوں میں رنگ بھردے میرے لہو کو شراب کر دے

یہ خوب کیا ہے یہ رشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشناسی کیا ہے
بڑا مزہ ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو راز حیات کہہ دوں حقیقت کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پھر دوں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلاف تقدیر کر رہا ہوں پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم پر ہی چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے، مری مزا کا حساب کر دے

حفیظ کے مجموعہ ہائے کلام سے ایسے اشعار اور ایسی غزلیں انتخاب کی جاسکتی ہیں
جو اپنے اندر دلکشی اور حسن رکھتی ہیں۔ ان میں انفرادیت بھی ہے اور فکر و فن کی آمیزش بھی۔
اس لئے ایسی غزلوں اور ایسے اشعار کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تعداد بہت
کم ہے۔

بہ صرف یہ کہ حفیظ نے اپنی قادر الکلامی کا سکہ نظم نگاری اور غزل گوئی کے میدان
میں بٹھایا بلکہ گیت ان کے ہاتھوں نئی زمینوں اور نئے آسمانوں سے ہم کنار ہوا۔ ان کے

گیتوں میں موسیقی اور شیرینی ان کے تمام ماقبل اور معاصرین گیت کاروں سے زیادہ ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ اردو میں گیت ان کے ہاتھوں مقبول و مشہور ہوا۔ حفیظ کافن حقیقی معنوں میں ان کے گیتوں میں چمکتا ہے۔ گیتوں کے لئے جس ترجم اور نغمہ ریزی کی ضرورت ہے وہ ان کے گیتوں میں ہی نہیں ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی بدرجہ اتم ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض نظموں پر گیت ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعض گیت نظم کی ہیئت اختیار کر لیتے ہیں اگرچہ گیت کافن اختصار و اعجاز کافن ہے اور اس میں طوالت و تکرار نقش ہے مگر حفیظ کے گیتوں کا کمال یہ ہے کہ طوالت و تکرار کے باوجود اپنی دلکشی اور جاذبیت نہیں کھوتے۔ گیت کار حفیظ اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ اس کی دوسری حیثیتیں لوگوں کی نظرؤں سے او جھل ہو گئیں۔ اس وجہ سے شاعری کی دنیا میں ان کو نقصان عظیم ہوا۔ شعر و ادب کی محفل میں ان کو گیت کار کی حیثیت سے مستند سمجھا گیا مگر ایک شاعر کی حیثیت سے لوگوں نے ان کے فن کی طرف کم ہی توجہ کی اس لئے جب حفیظ نمبر نکالنے کا اعلان افکار، لاہور نے کیا تو اس کے مدیر صہبا لکھنوی کو ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ ان کے فن و فکر پر لکھنے والے وہ حضرات نہیں ہوں گے جنہوں نے جوش نمبر کے لئے لکھا ہے:

”دیکھئے جوش نمبر کے لئے لکھنے والے جو بزرگ ہیں اس طرز
کے لوگ حفیظ نمبر کے لئے لکھنا پسند نہ کریں گے۔ یقیناً بقول آپ کے
میری سب سے یاد اللہ ہے۔ ان میں سے اکثر اہل نظر بھی ہیں۔ اسلوب
بیان کی نزاکتوں اور زبان کی انوٹوں کو جانے والے بھی ہیں۔ میری تحسین
بھی فرماتے ہیں لیکن یہ نہ بھولئے کہ جہاں مقصدیت کم ہو لیکن پرانا جذبہ
تربيت و طینت وافر ہو وہاں کند ہم جنس باہم بہم جنس پرواز کا نقش ہر عالم
پیدا و ہویدا رہتا ہے۔“

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حفیظ کے تعلقات سب لوگوں سے

تحے پھر بھی کسی نے ان کے فلک و فن کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں کی۔ یہ اس بات کی علامت ہرگز نہیں ہے کہ ان کی شاعری میں ایسے اوصاف نہیں ہیں جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے کیونکہ جو اقتباسات اس حصہ کے آغاز میں درج ہوئے ہیں ان سے یہ اندازہ پاسانی لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو مختلف ناقدوں نے الگ الگ ڈھنگ سے خراج تحسین پیش کیا ہے مگر اس طرح حفیظ کی شاعری اجزاء پر پیشاں ہو گئی ہے۔ اس کا کل ہمارے سامنے نہیں آتا ہے۔ یہ اجزاء پر پیشاں مل کر ایک کل تو بناتے ہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کل کی شناخت کی جائے۔ جب بھی ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوں گے حفیظ کی شاعری کی خوبیاں اور خامیاں ہماری نظرؤں کے سامنے ہوں گی۔ اس کے بعد حفیظ کی شاعرانہ عظمت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

حفیظ جالندھری کی شاعری میں فلک کے گہرے خطوط نہیں ملتے اس کی شکایت عام طور سے لوگوں نے کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے ان کی شاعری کو اقبال کی شاعری کے پس منظر میں دیکھا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اقبال کی شاعری میں فلک و فن کا جتنا خوبصورت امتزاج ملتا ہے اتنا خوبصورت امتزاج حفیظ کی شاعری میں نہیں ملتا لیکن حفیظ نے اپنے کو مناظر قدرت اور مظاہر فطرت سے جتنا قریب کر لیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے کیوں کہ کوئی دوسرا شاعر اس معاملہ میں ان کی ہمسری نہیں کرتا۔ اپنی ایک نظم میری شاعری میں حفیظ نے اپنی شاعری کے موضوعات شرح و بسط سے لکھے ہیں۔

یہ نغمہ سرا جو باروں کی دنیا

یہ ہنگامہ زا آبشاروں کی دنیا

فلک آشنا کوہ ساروں کی دنیا

یہ پھولوں کی بستی بہاروں کی دنیا

یہی ہے مرے شاہکاروں کی دنیا مری شاعری ہے نظاروں کی دنیا

اس نظم میں انسان، غنی و شادی، مرحوم دوستوں کی یادیں، عزیزوں کی یادیں اور غم گساری و شادمانی جیسے موضوعات کی طرف حفیظ جالندھری نے اشارے کئے ہیں۔ یہ موضوعات نہ تو گھرے ہیں اور نہ بسیط لیکن اپنے اندر خلوص رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اردو گرد کے ماحول سے اثر قبول کیا ہے اور اپنی شاعری میں اپنے مشاہدے اور تجربوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ عصری حیثیت کی بھی آنچ بہت مدھم انداز میں ان کی شاعری میں ملتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری زندگی اور ماورائے زندگی کے دوسرے مسائل کو بھی سمیٹ لیتی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات سے متعلق ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے رقم کیا ہے:

”وہ نئی صدی کے کسی مخصوص مکتب خیال سے تعلق نہیں رکھتے،
کسی خاص نظرے کی ترجیحی ان کا مقصد نہیں، اصل بات تو یہ ہے کہ ان کا
کوئی نظریہ حیات ہی نہیں وہ مفکرانہ تعمق سے حیات و کائنات پر نگاہ ڈالنے
کے عادی نہیں لیکن س کے باوجود ان کی فلکری شخصیت کامس ان کی کئی
نظموں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک رومانی شخصیت ہے جونغہ، مستی،
حسن، بے فکری، لا ابالی پن کے لطیف عناصر سے مل کر بنی ہے اور مناظر
فطرت یا زندگی کے کسی اور واقعہ سے متاثر ہو کر جذبہ و احساس کے مرتعش
تاروں کونغہ رینگر دیتی ہے۔ حفیظ کی شخصیت راشد یا اقبال کی سی داخلی گہرائی
نہیں رکھتی اور نہ ہی اس صدی کی کرب انگلیز نفیاتی اور رومانی پیچیدگیاں
ان کے حصے میں آئی ہیں۔“^۱

یہ صحیح ہے کہ حفیظ کی شاعری میں اس صدی کی کرب انگلیزیاں اور نفیاتی اور رومانی پیچیدگیاں نہیں ملتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ شاعری صرف انہیں موضوعات پر کی جاسکتی ہے۔ اگر

¹ جدید اردو نظم اور پوربی اثرات از ڈاکٹر حامدی کاشمیری، صفحہ ۳۲۲

اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ حفیظ کی شاعری اپنے اندر جاذبیت اور دلکشی رکھتی ہے۔ اس میں احساس و مشاہدے کی آنج ہے۔ ہمارے لئے لطف و کیف کا سامان ہے جو شاعر ہمارے لئے لطف و کیف کا سامان فراہم کرتا ہے اس کی شاعری سے ہم کیوں کر صرف نظر کر سکتے ہیں۔ یہی اسباب ہیں جو حفیظ کو اردو شاعری میں ایک مقام دیتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا گمان انہی خطوط پر ہوتا ہے۔

حفیظ جالندھری کی شاعری اپنی شیرینیت، موسیقیت، نغمگی، منظرکشی، رومانی انداز بیان اور نادر تشبیہوں اور استعاروں کے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ اس مقالہ کے گزشتہ ابواب میں مختلف اصناف کے تحت ان کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان کی روشنی میں کہیں حفیظ کی شاعری ہمارے دلوں کو موهتی ہے کہیں ان میں کوئی جاذبیت نہیں ملتی، کہیں دلکشی و رعنائی کے نئے دائے بناتی ہے کہیں سہل ممتنع کی مثال پیش کرتی ہے۔ مگر ہر جگہ نغمگی، شیرینی، موسیقی، منظرکشی اور رومانی انداز بیان کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس لئے حفیظ کو گھرے اور بڑے خیالات پیش کرنے والے شاعر کی حیثیت سے ہم اگر نہ تسلیم کریں تو بھی موسیقی، شیرینی، نغمگی، سہل ممتنع اور رومانی انداز بیان کے باوصف ایک منفرد شاعر تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ حقیقت کی عظمت یہی ہے۔

مستند محقق اور ناقد ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے دیکھیں:

”حفیظ صاحب ایک ایسے شاعر تھے جنہوں نے اپنے کلام سے اپنے دور کو متاثر کیا تھا۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ بہت کچھ کہا اور بہت کچھ سنایا۔ وہ ایک مقبول عام شاعر تھے اور جس محفل میں بھی جاتے اپنے دل ربا ترنم اور دلچسپ شاعری سے اہل محفل کا دل موہ لیتے..... حفیظ جالندھری ایک پر گوش از اور بے باک انسان تھے، وہ گزشتہ پچاس سانچھ سال سے شاعری کر رہے تھے اور اس سارے دور کا ایک حصہ تھے۔ یہ دوران کے

ساتھ سمت گیا اور چلا گیا۔“

(بحوالہ بیسویں صدی نئی، دہلی جنوری ۱۹۸۳، صفحہ ۱۵)

ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ بات بڑی آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ حفیظ نے حالی اور اقبال کے بعد اردو شاعری میں بعض اضافے کئے ہیں۔ ایک طرف مکتب کو اس کا عظیم الشان ماضی آئینہ کر کے دکھایا اور دوسری طرف اپنی شیرینیت، موسیقیت اور نغمہ ریزی سے اردو شاعری کے قالب میں نئے گوشے پیدا کئے۔ اس حیثیت سے ان کی شاعری قابل قدر ہے۔ ان کے کلام کا نقش جریدہ عالم پر ہمیشہ ہمیشہ ثابت رہے گا اور ان کی یاد دلاتار ہے گا۔ ان کی عظمت کے ثبوت میں ساغر نظامی کی یہ رائے نقل کرتی ہوں جو میرے خیال میں بہت ہی منصفانہ ہے:

”حفیظ جاندھری ہندوپاک کے ان چند شاعروں میں سے ایک
تھے جن کا تاریخِ ادب میں نام رہے گا۔ حفیظ نے روایت کے حلقوں میں
رہ کر اردو غزل کو فروغ دیا۔ اپنی نظموں سے اردو کو نئے اسالیب دے۔
شاہنامہ لکھ کر مسلمانوں کی خدمت کی۔ تمام عمر اردو کی خدمت میں گزاری۔
کئی رسالوں کی ادارت کی، کئی ادبی اداروں میں کام کیا۔“ ۱

* * *

۱۔ حفیظ جاندھری از ساغر نظامی، بیسویں صدی دہلی، صفحہ ۱۸

حرف آخر

حفیظ جالندھری نے ایسے خانوادے میں آنکھیں کھولیں جہاں شعروادب کی روایت نہیں ملتی۔ انہوں نے علوم متداولہ کی تحصیل کی طرف بھی کوئی دیپسی نہیں دکھائی بلکہ اس کوچے سے کنارہ کش ہونے میں عافیت دیکھی۔ اس کے باوجود پون صدی تک شعروادب کی خدمت کرتے رہے۔ یہ ایسی بات ہے جو اچھے اچھوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں دوسروں کی در اندازیوں کا جو ذکر کیا ہے اسی پس منظر میں کیا ہے۔ لکھا ہے:

”سات برس کی عمر سے شاعر ہوں وہ بھی پنجاب کے صوبے میں
رہ کر اردو زبان کا شاعر۔ میری دو آلبی جالندھری پنجابی کو تو واگہ کے اس پار
میرے ہی گاؤں کی بولی جانتے تھے۔ بھلا اردو والے میری اردو کو“ گون
”کی ٹھوپی کیسے گردانیں گے۔ مان لینے کیلئے کوئی تک بھی تو ہونی چاہئے۔
ہائے یہ تک! اسی نے میرے ساتھ رہ کر میرے ہاتھوں بن سنور
کر بار بار میرے رقبوں سے مجھے پٹوایا ہے۔
عرض ہنر ہی وجہ شکایات ہو گئی
چھوٹا سا منہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی ۔

چھوٹے سے منھ سے بڑی بات ہونی ہی تھی۔ قسام ازل نے شاعری کا جو ملکہ ان کو ودیعت کیا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا تھا جو ہمارے سامنے ہے۔ کوئی فنکار فن کے ابنتے ہوئے سرچشمے کو بہت دیر تک اپنی ذات میں دفن نہیں رکھ سکتا۔ فن اظہار کے راستے تلاش کر لیتا ہے اور فنکار کو اس طرح مجبور کرتا ہے کہ بعض اوقات فنکار اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ فنکاری خدا کا عطیہ ہے اسی طرح جس طرح حسن و دلکشی خدا کا عطیہ ہے۔ کوئی حسین اس لئے نہیں ہے کہ اس نے اس راہ میں بڑی ریاضت کی ہے بلکہ اس لئے کہ خداوند کریم نے اس کو حسین بنایا ہے۔ اسی طرح کوئی فنکاری اس لئے نہیں کرتا ہے کہ اس نے اس کے لئے محنت و مشقت کی ہے ہاں جس طرح مصنوعات کی مدد سے چہرے کے خدوحال کو سبک اور جاذب نظر بناتے ہیں اسی طرح ریاضت، محنت اور جانفشاںی سے فن کو جلا بخشنے کا کام لیتے ہیں۔ حفیظ جالندھری نے شعر و ادب کی شمع اسی پس منظر میں روشن کی۔ ان کے اپنے قول کے مطابق انہوں نے سات برس کی عمر میں شعر موزوں کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس عمر کا ایک شعر ہے۔

محمد کی کشتی میں ہوں گا سوار
تو لگ جائے گا میرا بیڑا بھی پار

عجب بات ہے کہ مرنے سے کچھ دیر قبل انہوں نے ایک غزل کہی جس کو ان کے عزیز دوست پروفیسر مرزا سوز نے نقل کیا۔ اس غزل کا آخری شعر ہے۔
ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم پر ہی چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے، مری سزا کا حساب کر دے
مندرجہ بالا ہر دو اشعار پر غور فرمائیے تو محسوس ہو گا کہ پہلا شعر نعمت کا ہے اور دوسرا حمد کا۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ حفیظ کی شخصیت پر مذہب کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ان کی پروش و پرداخت ہوئی وہ بھی

مذہبی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری اور فنکاری کا مخصوص رنگ مذہب ہے۔ اس ضمن میں حفیظ کے شہادتی جملے ملاحظہ فرمائیں:

”اللہ اکبر کی اذان نے میرے پیدائشی مسلمان ہونے کا اعلان
میرے کان میں کر دیا تھا۔ پھر چھ برس کی عمر میں مسجد سے محققہ دالان میں صبح شام حاضری دیتے ہوئے بغدادی قاعدے کے بعد قرآن کریم میں نے معنی جانے بغیر ناظرہ پڑھ لیا تھا اور کسی لفظ کا مفہوم معلوم ہوئے بغیر ہی کریما اور مقیماں بھی دونوں رث لی تھیں۔“^۱

شاہنامہ اسلام جلد چہارم کے دیباچہ میں فرقہ گورکچوری کے بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے حفیظ نے بڑی صراحة سے لکھا ہے۔

”شاہنامہ اسلام جذبہ ملی سے لکھا جا رہا ہے۔ لہذا وہ لوگ جو اس کتاب کے مخاطب ہیں ہندوستان کے ان نئے خوابوں کی تعبیر اور اس نئی دنیا کے جنم کے درد و کرب میں اپنے لئے اپنے پیشوایان ملت ہی کی حیات مبارکہ کے واقعات سے شاہنامہ اسلام ہی کے ذریعہ انشاء اللہ وہ راستہ پالیں گے جس کی ان کو اس پر آشوب عالم میں ضرورت ہے۔“^۲

مذہب سے اتنی گہری وابستگی اور اس کے اظہار میں اتنی صفائی شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے روکھی ہو۔ اقبال پر آج جب یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ ان کے مخاطب مخصوص لوگ ہیں تو اس کو رد کرنے کے لئے طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لیا جاتا ہے جب کہ حفیظ نے اپنے لئے کسی تاویل کا سہارا تلاش نہیں کیا۔ یہ اس بات کی غماز ہے کہ حفیظ کا مزاج مذہبی ہے۔ ان کی شخصیت کا سب سے گہرا رنگ مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۵

^۱ حفیظ جالندھری آپ بیتی نمبر، نقوش، لاہور

^۲ دیباچہ، شاہنامہ اسلام، جلد چہارم

میں نغمہ زار شائع کرنے کے فوراً بعد انہوں نے شاہنامہ اسلام کی طرف توجہ کی۔ شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد اگرچہ ۱۹۲۹ میں شائع ہوئی مگر اس کے لکھنے کا کام ۱۹۲۶ میں شروع کر دیا گیا تھا اور اس کی چوتھی جلد ۱۹۳۷ میں منصہ شہود پر آئی۔ اس طرح شاہنامہ اسلام کے لکھنے کا کام غلام ہندوستان میں شروع ہو کر آزاد ہندوستان میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس درمیانی عرصہ میں نغمہ زار کے علاوہ سوز و ساز اور تخلیقہ شیریں دو مجموعہ ہائے کلام زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ اس میں جو کلام ہے اس میں فکر کے دوسرے خطوط بھی ابھرتے نظر آتے ہیں لیکن ان خطوط کی حیثیت وقتی اور فوری ہے۔ شاعر صرف وجدان اور جذبے سے ہی متاثر نہیں ہوتا بلکہ ماحول اور عصری تقاضے بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے حفیظ کی وہ شاعری جو مذہبی اور ملی جذبے سے الگ ہے وہ وقتی اور فوری جذبے کی عکاسی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ وقتی اور فوری جذبے حفیظ کی شخصیت میں جگہ پا کر دائیٰ نقوش کی شکل میں ظاہر ہوئے ہوں۔ اس کے مساوا حفیظ کی شاعری میں ملنے والے مذہبی اور ملی جذبے نے دوسرے احساسات کو بھی تحریک دی ہے۔ مثلاً ان کی شاعری میں حب وطن، وطن دوستی، جاں ثاری، انگریزوں کی تہذیب و تمدن سے منافرت، مناظر قدرت اور مناظر فطرت سے دلچسپی، ہندوستانی تہذیب سے یگانگت، اساطیر سے لگاؤ کی شکل میں جورنگ قوس قزح کی طرح بکھر گئے ہیں وہ سب کے سب ان کے مذہبی اور ملی جذبے سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کی شاعری کا یہی رنگ اقبال سے قریب ہوتا ہے جس کے بارے میں عبدالقدوس سروری نے رقم کیا ہے:

”اقبال اور ان کے کلام کے ساتھ والہانہ لگاؤ نے ان کے زمانے کے بہت سے نوجوان شاعروں کو غیر شعوری طور پر اقبال کے انداز کلام سے متاثر کیا۔ حفیظ بھی اس اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ ان کی اکثر نظموں سے اس اثر کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے لئے ”زندگی“ یا آزاد وادی، وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے جن میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے خیال کی

تفسیر کی گئی ہے۔

اقبال کی شاعری کا آخری نور بعد کے اکثر شاعروں کے لئے نئی تحریکات اور خیالات کی افزائش کا باعث بن گیا ہے۔ حفیظ نے اس وجہ تحریک سے سے جو کام لیا ہے وہ انیس، دبیر اور حالی کے بعد سے آج تک کوئی نہ لے سکا تھا لکن حفیظ نہ تو انیس کی طرح مرثیہ نگاری کرتے ہیں اور نہ حالی کے ساتھ مسلمانوں کے حالات پر آنسو بھاتے ہیں۔“^۱

اقبال کی شاعری سے حفیظ کس درجہ متاثر تھے اس کا اندازہ ان کی آخری خواہش سے ہوتا ہے۔ حفیظ کی آخری خواہش تھی کہ مرنے کے بعد ان کو اقبال کے بغل میں دفن کیا جائے۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنی ابیہ اور اپنے عزیز دوست مرزا محمد منور سے کیا تھا۔ حفیظ کہتے تھے علامہ اقبال کے بعد انہوں نے سب سے زیادہ اسلام کا نام بلند کیا ہے اس لئے انہیں شاہی مسجد کے سامنے علامہ کے پہلو میں دفن کیا جائے۔

اقبال سے بہت متاثر ہونے کے باوجود انہوں نے اپنا راستہ خود بنایا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لکیر کے فقیر بنے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری علامہ اقبال کی شاعری سے ممیز ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری جہاں فکر و فن کا حسین امتزاج ہے وہاں حفیظ کی شاعری میں فکر اور موسیقی و رغنا بیت کا دلکش امتزاج ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ جس طرح شاعری کا ملکہ ان کوازل سے ودیعت ہوا ہے اسی طرح موسیقیت اور غنا بیت کی صلاحیتیں بھی ان کوازل سے عطا ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری میں اقبال کی طرح فکر کے گہرے خطوط نہیں ابھرتے لیکن حال، تجربہ اور مشاہدے کے ہلکے ہلکے خطوط نے غنا بیت اور موسیقی کا ایسا غلاف اپنے اوپر چڑھایا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے مزاج کی اس خصوصیت نے اردو شاعری میں چند خاطر خواہ اضافے کئے۔ نظمیں گیتوں سے چشمک کرنے لگیں اور گیت نظموں سے آنکھیں

ملانے لگے۔ اس اتحاد و امتزاج نے نظم نگاری کی ہیئت میں توسعہ کی۔ گیت ان کے ہاتھوں عروج کی منزلوں تک پہنچا۔ اکثر اہل قلم اور صاحب الرائے نے حفیظ کے ان اوصاف کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ فرقہ گورکپوری نے رقم کیا ہے:

”شاعر نے ان نظموں کو موزوں کرنے میں، ان کو رپنے میں
نکھارنے میں اور سنوارنے میں ظاہر ہے کہ حالی، آزاد، اکبر، چکبست،
درگاہی، سرور، اقبال بلکہ انیس اور نظیر اکبر آبادی تک کسی نظم گوشاعر سے
اٹھنیں لیا۔ ایسی شاعری، گیت سے ایسی ملتی جلتی ہوئی نظمیں پنجاب میں
اس لئے پیدا ہوئیں کہ پنجاب کا صوبہ اردو پرست ہوتے ہوئے اردو زدہ
نہیں تھا۔ جو صوبہ ناخ کو پیدا کر سکتا ہے (اگر چہ ناخ آئے لاہور سے تھے)
وہ صوبہ آسام کے تارے توڑ لاسکتا ہے۔ انیس، چکبست، نظیر اکبر آبادی اور
جوش ملیح آبادی، کوچھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اقبال، تلوک چند محروم اور حفیظ
جالندھری کو پیدا نہیں کر سکتا۔“ ۱

نظم نگاری ہو یا غزل گوئی۔ مثنوی نگاری ہو یا گیت سب میں حفیظ منفرد و یکتا نے روزگار ہیں اگر چہ اس مقالہ کے گزشتہ سطور میں ان اصناف سے متعلق الگ الگ حفیظ کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا گیا ہے کہ نظم نگاری اور مثنوی نگاری کے میدان میں وہ بہت حد تک ناکام ہیں۔ ان کی نظمیں اور مثنویاں فنی اعتبار سے اعلا پایہ کی نہیں ہیں۔ ان میں زبان و بیان کی غلطیاں بھی ہیں لیکن ان میں ترجم اور موسیقی کا جو آبشار موجز ن ہے وہ بے نظیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری میں اس زور شور کا ترجم اور موسیقی اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ابتداء میں بہت سے لوگوں نے ان کو اردو کا بنسرا بجا، شاعر شباب وغیرہ کہا۔ لیکن حفیظ کے گیت اور غزل دل سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ان

۱۔ حفیظ۔ تقریاز فرقہ گورکپوری نشریہ آل اندیار یڈیو، لکھنؤ

میں جذبہ و احساس کی آنج نظموں کے مقابلے میں تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ان میں خلوص کی فراوانی بھی ہے اور صنائی کا کمال بھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ گیت اور غزل نظم کے مقابلہ میں غنائیت اور غزل سے زیادہ قربت و علاقہ رکھتی ہیں۔

البته حفیظ کی وہ نظمیں اردو شاعری میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہیں جن کا تعلق مناظر فطرت اور مظاہر قدرت سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان نظموں میں فطرت اپنے کو بے نقاب کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان نظموں میں استعمال ہوئے استعارے اور تشبیہیں بھی خاص نادر ہیں۔ بعض نادر تشبیہوں کی طرف پچھلے سطور میں توجہ دلائی گئی ہے اور یہ عرض کیا گیا ہے کہ اردو شاعری میں یہ بالکل اچھوٹی ہیں:

اسی کے بارے میں حفیظ کی وہ نظمیں بھی قابل توجہ ہیں جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں میں بچوں کی نفیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ان نظموں کے ذریعہ بہت آسانی سے معلومات کا خزینہ بچوں کے ذہن و دماغ میں اندھیلا جاسکتا ہے۔ ان نظموں کے متعلق عبدالمجید سالک کی رائے بہت موزوں ہے۔

”ضرورت اس امر کی ہے کہ بچوں کے والدین اور ان کے استاد اس عظیم الشان خدمت میں حفیظ کا ہاتھ بٹائیں۔ اس کی نظمیں بچوں کو حفظ کرائیں اور ان کے مطالب کا نقش ان سادہ دماغوں میں اس طرح بٹھا دیں کہ کبھی مٹنے نہ پائے۔ میرے نزدیک حفیظ کے کمال فن اور اس کی محنت و جگر کاوی کا یہی ایک معاوضہ ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے نصب العین کی تیکیل میں مددگار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ نظمیں قوم کے ہر طبقے میں بے انتہا مقبولیت حاصل کریں گی۔“ ۱

حفیظ کی شاعری سے متعلق ان باتوں کو ذہن میں رکھئے جو اوپر بیان ہوئی ہیں تو

۱. دیباچہ، بچوں مala، از عبدالمجید سالک

محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک مقبول و مشہور شاعر ہیں۔ بعض اصناف میں انہوں نے انہت نقش چھوڑے ہیں، بعض اصناف میں روایت کو آگے بڑھانے میں معاونت کی ہے، بعض اصناف میں بہیت میں توسعہ کی ہے اور بعض اصناف کے تاریک گوشوں کو روشنی بخشی ہے۔ اتنی خوبیوں سے متصف شاعر کیوں ناقدوں اور انشا پردازوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنا؟ تعجب خیز بات ہے۔ اگر چہ اپنے کمالات کا شمار کرتے ہوئے حفیظ بھی چوکتے نہیں مگر اس کے ساتھ ہی اپنے معاندوں کا ذکر کے بغیر نہیں رہتے چنانچہ ماہنامہ نقش، لاہور میں اپنی آپ بیتی رقم کرتے ہوئے لکھا ہے:

”آج پاکستان کا ہلال امتیاز ہوں اور پرانڈ آف پروفمنس بھی۔“

پاکستان سے پہلے غیر ملکی حکومت نے خال بہادر سے مخاطب فرما کر میر منھ بند کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ اپنی وطنی ریاستوں نے ملک اشرا اور نواب حسان الملک بہادر بھی بنادیا تھا علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک بہت بڑے ادبی جلسے میں سجاد حیدر یلدزم نے علی الاعلان مجھے اردو کا بنسري بجیا اور اسلام کا شہنائی نواز بھی قرار دیا تھا۔ قوم، ملک اور ملت، فروعی اسلام اور شاعر پاکستان اور نہ جانے کن اعزازات کے ساتھ نوازتے ہی چلے جا رہے ہیں۔“

ظاہر ہے کہ جس فذکار کو دنیا نے اتنی عزت، مقبولیت اور شہرت کے مند پرستمکن کیا وہ کس بات کی خلش اپنے دل میں رکھتا ہے جو ہمیشہ اپنے دراندازوں معاندوں کا قصہ چھیڑتا رہتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے قبل حفیظ نے جو کچھ رقم کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کسی قسم کی خلش ہے۔ یہ خلش کیسی ہے جو آپ بیتی رقم کرنے سے قبل بطور عنوان دو اشعار نقل کرنے پر اکساتی ہے۔

عرض ہرمندی وجہ شکایات ہو گئی
چھوٹا سامنہ تھا مجھ سے بڑی بات ہو گئی

یاروں کی بہمی پہنسی آگئی حفیظ
یہ مجھ سے ایک اور بڑی بات ہو گئی

عرض ہنرمندی یا یاروں کی بہمی پہنسی بڑی بات نہیں ہے بلکہ اپنے ہلکے
اشعار سے بڑے بڑے مشاعروں کو مار لینا ہے بڑی بات ہے۔ ایک طرف تو حفیظ کی
مقبولیت ایسی تھی کہ ان کے آتے ہی مشاعرے میں چھتیں اڑنے لگتی تھیں اور دوسری طرف
یہ حال تھا کہ سنجیدہ حلقة میں ان کو وہ مقبولیت اور مقام نہیں مل رہا تھا جس کی ضمانت
مشاعرے دیتے تھے۔ اس کی وجہ صاف اور ظاہر ہے۔ حفیظ کی شاعری میں فکر و فن کا اتنا حسین
امتزاج نہیں ہے جتنا اقبال اور دوسرے شاعروں کے یہاں۔ فنی معیار پر بھی ان کی بعض
نظمیں اعلا پایے کو نہیں پہنچتیں۔ ایسی صورت حال میں سنجیدہ ناقد اور دانشور ان کو وہ مقام نہیں
دلے سکتا جو ان کی عوامی مقبولیت کی مقاضی ہے۔ پھر بھی ان کی شاعری کے اہم خطوط اور
رنگوں کی تخصیص کر کے اردو کے ناقدوں نے ان کو بلند مقام عطا کیا ہے۔ اگرچہ جوش ملیح آبادی
سے ان کی چشمک رہا کرتی تھی اس کے باوجود جوش نے حفیظ کو جن الفاظ میں سراہا ہے وہ
اپنے اندر وزن اور معقولیت رکھتے ہیں۔ جوش کے الفاظ ہیں:

”حفیظ صاحب ایک ایسے شیریں مثال شاعر ہیں جو دلوں میں گھر
کر چکے ہیں۔ ان کی شاعری لطافت و سلاست، مخاس و شگفتگی، روانی،
زنگیں اور راگنی کے لپٹوں سے مہکی ہوئی ہے۔ ان کے رسیے گیت فضا میں
ساؤن کے بادلوں کی طرح جھوم رہے ہیں اور ان کا دلنشیں و سامعہ نواز
ترنم ادب کی محراب میں جھنکار پیدا کئے ہوئے ہے کہ زہرہ آسمان پر رقص
کرتی ہے۔“¹

واقعہ یہ ہے کہ شاہنامہ اسلام کو اگر ذہن سے ہٹا دیں تو حفیظ کی شاعری کو اس سے

بہتر خراج تحسین نہیں پیش کیا جاسکتا۔ شاہنامہ اسلام اگرچہ شعری و فنی خوبیوں سے مالا مال نہیں ہے مگر شاعر کے ذہن کی صحیح غمازی کرتا ہے اس لئے اس کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

بہر طور ان تمام باتوں کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ پورے پون صدی تک حفیظ نے شعرو شاعری کی محفل کو اپنے ترجم اور موسیقی سے گرم کئے رکھا ساتھ ہی مذہب و ملت کی بہتری کی خاطر اپنی بھر کوشش کی۔ فن و شعر کی شبستان میں بھلے ہی شاہنامہ اسلام نے روشنی نہ پھیلائی ہو لیکن لاکھوں سامعین کے دلوں میں اس سے روشنی ہوئی، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی موت پر احمد ندیم قاسمی نے فرمایا:

”جالندھری صاحب میسویں صدی کے نصف آخر کے بہت بڑے
شعراء میں سے ایک بڑے شاعر تھے۔ غزل، گیت اور نظم میں ان کا اضافہ ہمیشہ^۱
یادگار رہے گا۔ خاص طور پر تاریخ اسلام کو منظوم کرنے میں انہوں نے سلیقے
کا اظہار فرمایا اور جس سلاست اور روانی کے ساتھ واقعات کو نظم کیا اس
کا جواب ہماری پوری اردو ادب کی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔“

* * *

کتب و رسائل

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مرتب
(۱)	لغہ زار	حفیظ جالندھری
(۲)	سوز و ساز	حفیظ جالندھری
(۳)	تلخاہہ شیریں	حفیظ جالندھری
(۴)	شاہنامہ اسلام	حفیظ جالندھری
(۵)	سلام	حفیظ جالندھری
(۶)	ہندوستان ہمارا	حفیظ جالندھری
(۷)	پھول مala	حفیظ جالندھری
(۸)	تہجد کے مناجات	حفیظ جالندھری
(۹)	مکاتیب غالب	امتیاز علی خاں عرشی
(۱۰)	اردو شاعری کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر اعجاز حسین
(۱۱)	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن عظمی
(۱۲)	علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز	نیم قریشی
(۱۳)	اردو شاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا
(۱۴)	نظم جدید کی کروٹیں	ڈاکٹر وزیر آغا

عبدال قادر سروری	جدید اردو شاعری	(۱۵)
آل احمد سرور	نئے اور پرانے چراغ	(۱۶)
ڈاکٹر حامدی کاشمیری	جدید اردو نظم اور پوربی اثرات	(۱۷)
ڈاکٹر قیصر جہاں	اردو گیت	(۱۸)
کلیم الدین احمد	اردو شاعری پر ایک نظر	(۱۹)
ڈاکٹر سید اعجاز حسین	محصر تاریخ ادب اردو	(۲۰)
اظہر علی فاروقی	لوک گیت	(۲۱)
میراجی	گیت ہی گیت	(۲۲)
عشرت رحمانی	تیرے گیت	(۲۳)
زبیر رضوی	لہر لہرندیا گہری	(۲۴)
ساغر نظامی	رنگ محل	(۲۵)
مولانا حالی	موجز اسلام	(۲۶)
مولانا حالی	مسدس حالی	(۲۷)
عنوان چشتی	اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے	(۲۸)
شیمیم خنفی	نئی شعری روایت	(۲۹)
ڈاکٹر عبادت بریلوی	غزل اور مطالعہ غزل	(۳۰)
ڈاکٹر عبادت بریلوی	جدید شاعری	(۳۱)
ڈاکٹر عبادت بریلوی	شاعری اور شاعری کی تنقید	(۳۲)
محمد قاسم صدیقی	بھارت کی لوک کتھائیں	(۳۳)
C. Day Lewis	The Lyrical Impulse	(۳۴)
Norman Hepple	The Lyrical Forms in English	(۳۵)

رسائل

- (۳۶) افکار، لاہور
حفیظ نمبر
- (۳۷) مخزن، لاہور
مدیر حفیظ جاندھری ۱۹۲۷ء - ۱۹۳۰ء
- (۳۸) جمالتان، دہلی
ہمایوں، لاہور
- (۳۹) عالمگیر، لاہور
- (۴۰) نیزگ خیال، لاہور
- (۴۱) ادبی دنیا، لاہور
- (۴۲) بہارستان، لاہور
- (۴۳) وطن، لاہور
- (۴۴) کلیم، دہلی
- (۴۵) عصمت، دہلی
- (۴۶) فنون، لاہور
- (۴۷) آواز، دہلی
- (۴۸) نقوش، لاہور
- (۴۹) زبان و ادب، پٹنس
- (۵۰) بیسویں صدی، دہلی

* * *